شین دار آدمی

احمد داؤد

پُرانے اور نئے افسانے کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ پُرانا افسانہ تو دبیز کینوس پر ایسے نقوش بناتا ہے جو صاف ترشے ترشائے اور جامد ہوتے ہیں، مگر نیا افسانہ آئینے کی سطح پر نقوش کو اجاگر کرتا ہے اور پھر کمال ہنرمندی سے ایک آئینے کو دوسرے کے مقابل لاکر در در عکسوں کے ایک لامتناہی سلسلے کو جنم دے ڈالتا ہے۔ احمد داؤد کے افسانے میں نئے علامتی افسانے کی یہ تہہ داری اپنی ساری نفاست اور لطافت کے ساتھ موجود ہے اور وہ کہانی کے پیکر سے منقطع ہوئے بغیر پرچھائیوں کے ایک جہاں ہوشربا کا منظر دکھانے پر قادر ہے۔

وزیر آغا

۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں سب سے توانا بھرپور اور صاحبِ اسلوب آواز احمد داؤد کی ہے۔ اس نے نئے افسانے کو نظریاتی چیرگی کے ساتھ ساتھ تاریخی اور ثقافتی ذائقے سے ہم آہنگ کیا طنز کی تیز کاٹ، جھٹکا دیتے، چٹکیاں لیتے، جملے، دبیز علامتیں، متحرک امیجز اس کے بھرپور مشاہدے، ذیرکی اور تاریخی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ انسانی رشتوں کا المیہ، معروضی دُکھ اور اجتماعی ٹوٹ اس کی کہانیوں میں عہد کی گواہی دیتے، سانس لیتے ہیں۔ بیانیہ میں نئے تجربے کرنے، شعری اور نثری زبان کے فرق کو مٹانے اور افسانے کی نئی زبان کی تشکیل میں اس کے افسانے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔

رشید امجد

احمد داؤد ناقابلِ تغییر اور داخلی تضادات سے پُر معاشرے کی تفہیم کا ادیب ہے اس کا لفظ جدید تر ہونے کے باوجود مروجہ تکنیکی روایوں سے یکسر مختلف اور منفرد ہے لفظ ایک حرکی DYNAMIC نظامِ تشکیل پیدا کرنے کی تکنیک میں اس کی نسل کا ایک بھی کہانی کار اس سے آگے نہیں۔

اختر حسین جعفری

احمد داؤد کا افسانہ انسانی کتھا کی واردات کا تسلسل ہے۔ اسی لیے تاریخ، ثقافت، تہذیب اور اجتماعی یادیں اس کی جڑیں دُور تک پھیلی ہیں۔ مگر، اس کی دنیا فرد، اجتماع، قوم اور عالمی انسانیت کے گرد در گرہ اندیشوں اور عذابوں سے ترتیب پاتی ہے۔ اس لیے اتنے بڑے کینوس پر تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے نام پر دھوکہ دہی کو احمد داؤد UN. NOTICED نہیں جانے دیتا۔ اس کے افسانے کسی ذاتی محرومی اور خود اذیتی کے تجربے کا شاخسانہ نہیں ہیں۔ وہ کلیت کے ساتھ اپنے عہد کے متعلق تجربے کے نتائج اور عصری واردات کے گہرے اثر کو افسانوں میں مخصوص اسلوب کے ساتھ پیش کرتے ہیں، یہ مخصوص اسلوب ان کے مزاج کی انفرادیت ہے ——— غیر مبہم طنز۔ واضح نقطۂ نظر اس اسلوب کو ایک با یقین اور پُر اعتماد مزاحمت کرنے والے کردار کا لہجہ عطا کرتا ہے۔

احمد داؤد وسیع تناظر میں فکری اور تہذیبی مسائل پر واردات اور کتھا کی زبان میں سوچنے والا افسانہ نگار ہے ——— اور یہی آج کے افسانے کی پہچان ہے۔

اصغر ندیم سیّد

اُردو افسانے کی قلبِ ماہیت کے بعد جن لوگوں نے اسے اعتبار بخشا۔ ان میں ایک اہم نام احمد داؤد کا ہے۔ احمد داؤد نے افسانے کی ہیئت اور اس کے اجزاء کو سالم حیثیت میں برقرار رکھتے ہوئے اس کے باطن کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ حیرت انگیز حد تک کامیاب ہے۔

علی حیدر ملک

دشمن دار آدمی

۲

دشمن دار آدمی

افسانے

احمد داؤد

ملنے کا پتہ

ندیم پبلیکیشنز کشمیری بازار، راولپنڈی

ترتیب و طابع — اعجاز راہی

سرورق — منصور راہی = تزئین — انور سعید

خطاطی — اعجاز کھوکھر

مطبع — ایس ٹی پرنٹرز۔ گوالمنڈی۔ راولپنڈی

طبع اوّل — گیارہ سو، مہینہ جون۔ سن انیس سو تراسی

قیمت پچیس روپئے

میجر اسحاق محمد مرحوم

کے نام

جن لفظوں میں ہمارے دلوں کی بیتیں ہیں، کیا صرف وہ لفظ ہمارے کچھ
بھی نہ کرنے کا کفارہ بن سکتے ہیں

کیا کچھ چھنتے معنوں والی سطریں سہارا بن سکتی ہیں، ان کا
جن کی آنکھوں میں اس دیس کی حدان ویراں صحنوں تک ہے

کیسے یہ شعر اور کیا ان کی حقیقت ؟

ناصاحب! اس اپنے لفظوں سے بھرے ہوئے کنستر سے چلو بھر بھیک کسی
کو دے کر

ہم سے اپنے قرض نہیں اتریں گے۔

اور یہ قرض اب تک کس سے اور کب اُترے ہیں،

تو اب یہ سب حرف، زبوروں میں جو مجلد ہیں، کیا حاصل ان کا
جبتک میرا یہ دکھ خود میرے لہو کی ٹکسالوں میں ڈھل کے دعاؤں
بھری اس ایک میلی جھولی میں نہ کھنکے جو رستے کے کنارے

میرے قدموں پہ بچھی ہے ؟

مجید امجد

ترتیب

پوری بات

نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے اپنے دل میں ایک مانوس و ہمہ گیر اپنائیت سی محسوس ہوتی۔ اس کی شخصیت بُرے خیالوں اور گندے اعمالوں کے باوجود اپنے اندر ساحرانہ کشش رکھتی تھی جس کا میں اسیر ہو چکا تھا اور اسی باعث نفرت کی وہ دیوار جو ہمارے درمیان کھڑی تھی اب گر گئی تھی۔ اس کا حلیہ جسے آدمی پہلی ہی نظر میں اپنے ذہن پر نقش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جہاں اس کے سفلے پن کا ڈھونگ رچا دیتا۔ وہاں اس رویئے کی بھی غمازی کرتا جو اس کی فطرت میں رچ گیا تھا۔ گلے میں لنڈی کوتل کا مفلر لٹکائے۔ بائیں کان میں سونے کا چھلا ڈالے، چیپڑے بال، سرمے سے سیاہ آنکھیں اور نیچے ٹائر سول کی جوتی جسے دیکھ کر کمزور دل دھڑکنا بھول جائے۔ کہ کب یہ اپنی جیب سے چاقو نکالے اور سینے پر رکھ دے۔

میری آنکھوں میں بے یقینی کے سائے دیکھ کر بولا۔

"تمہیں یقین نہیں ہے؟؟

"نن — نہیں، بالکل نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے پیار اور خوف کے ملے جلے جذبوں سے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا۔

"اس دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی ہونا ہے یہ تو معمولی بات ہے۔ آؤ لبٹی کی طرف چلتے ہیں"۔ اس نے مجھے بنچ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مگر پوری بات تو سناؤ"

"پوری بات یہی ہے کہ نہ ماں کو بخشتا ہے اور نہ لڑکیوں کو چھوڑا"۔

اس نے ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر تمبا کو نکالنا شروع کیا۔ اور میں پورا قصہ سننے کے شوق میں اس کے قدموں پر قدم رکھے لئی کی جانب جانے والے کچے راستے سے گزرتا رہا۔۔ لئی کے گندے پانی میں کمر کمر تک ڈوبی بھینس کھر مار مار کر نیچے کا پانی اوپر اور اوپر کا نیچے کر کے چھینٹے اڑا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ آیا ہوا کتا کبھی اس کنارے پر آتا اور کبھی دوسرے کنارے پر۔ بہتے پانی کے دونوں طرف اونچے نیچے ڈھلوں پر لڑکوں کی ٹولیاں بیٹھی وقت گزاری کے لئے تاش کھیلنے میں مشغول تھیں۔ سامنے کی عمارتوں کی اوٹ میں جاتا ہوا سورج اپنے عقب میں سرمئی دھول پھنکیا شام کی آمد کی دستک دے رہا تھا۔ کوؤں کی ٹولیاں اپنے دن بھر کے سفر کا پھل اپنے اپنے پوٹوں میں بھر کر واپس اپنے آلنوں کی طرف محو پرواز تھیں۔ ابابیلوں کے جوڑے اپنی تمام پھرتی کے ساتھ فضا میں چکر لگاتے اور پھر شرارتاً کوئی ابابیل کسی بھینس کے سر پر جا بیٹھتی اور چھینٹے زیادہ تیزی سے اڑنے لگتے۔

دونوں طرف کے مکانوں کی چھتوں پر عورتوں نے دن بھر کے گرم لمحوں کا اترا تارنے کے لئے چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں تنکوں کے پنکھے اٹھائے ہوئے وہ لمبی لمبی سانسیں لیتیں، اور پھر کسی دوسرے مکان پر نظر آتی ہوئی عورت کے متعلق باتیں شروع کر دیتیں۔

لئی کا پانی اپنی دیرینہ خاموشی کے ساتھ اپنے اندر شہر کے گھروں، سرائے بیلی رام کی طوائفوں کے غلیظ جسموں کی خفیہ بیماریوں، ہسپتالوں اور نالیوں سے آتا ہوا گندے پانی کا ذخیرہ لئے کسی بڑی لئی کی جانب رواں دواں تھا۔

میرے ساتھ اسے آتا دیکھ کر کنارے پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے سر اٹھا کر شکوک سہمی نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کھر پھیر کر کے منہ پھیر لیا۔ ایک قدرے صاف جگہ پر پہنچ کر اس نے بڑے تحکمانہ انداز میں ایک لڑکے کو بلایا اور اس سے مزید جگہ صاف کرائی اور پھر اسے ایک گالی دے کر کہا:۔

"جس جس نے ٹکری لگا رکھی ہے ان سے کہو یہاں سے اٹھ جائیں۔ ورنہ ....."

لڑکا سر جھکا کر چلا گیا اور ہم دونوں اس چھوٹے سے صاف قطعے پہ بیٹھ گئے۔

"ہاں تو پھر پورا قصہ سناؤں"

چسکا لگا رہے ہو؟ اس نے سگریٹ کے تمباکو میں چرس کی گولی ملاتے ہوئے کہا۔

عمر ہی چسکا لگانے کی ہے مگر تم بات بتاتے نہیں۔ چسکا کیا لگے گا۔

پوچھنا کیا چاہتے ہو؟؟

"یہی کہ یہ کیا کرتی ہیں"

"سب دنیا جانتی ہے کہ چلتی ہیں سب کی سب"

"مجھے تو بڑے شریف دکھتے ہو"

"میں تمہیں کیا دکھتا ہوں؟؟ اچانک اس نے ایسا سوال کر دیا جس سے میں ہمیشہ کتراتا تھا" تم بڑے اچھے ہو" میں نے جان چھڑانی چاہی۔

"اچھا یا برا نہیں صرف یہ بتاؤ کہ میں حلالی ہوں یا حرامی۔ سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں پنگا کوئی کرتا ہے اور پولیس مجھے پکڑ لیتی ہے۔ کیا میں ایسا ویسا نظر آتا ہوں"

"نہیں یار تم اپنا حلیہ ٹھیک کرلو۔ بہت اچھے نکل آؤ گے۔ مگر تم مجھے اسی حلیے میں پسند ہو تو پھر کیا ہوا یار۔ بات ہی بھلا دیتے ہو"

چھوٹے ہوتے وقت میں بڑا نقشی ہوتا تھا" اچانک وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور دھوئیں کی بدبو فضا کے سینے پر پھیلاتے ہوئے بولا۔ اور اسی وقت وہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ پہلے ماں گرم ہوئی پھر تینوں لڑکیاں۔ مزا آرہا ہے کیا۔؟ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ساری بات تو بتلاتے نہیں مزا کیا خاک آئے گا"

" یار شرم آتی ہے اس وقت کو یاد کر کے۔ یہ ساری برائیاں یہ نشے اسی گندے وقت نے دیئے ہیں۔ تو بچ کے رہنا"

مجھے اس کی باتوں سے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا مجھے اس کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

" یا تو پوری کہانی بیان کر دو یا انکار کر دو تاکہ میں چلا جاؤں"

میری ناراضگی بھانپ کر اس کے چہرے پر ایک معصوم سا رنگ ابھر آیا اور بڑے اداس لہجے میں کہنے لگا۔

"ناراض مت ہو تم ہی تو ایک آدمی ہو، جو مجھے منہ لگاتے ہو۔ برا نہیں مناتے۔ میں تمہیں ساری بات سناتا ہوں۔ میں وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں سے کھانا پینا اور سارے خرچے اور جب مجھے ذرا عقل آئی تو پتہ چلا۔ کہ میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ پہلے ماں پھر دو بڑی لڑکیاں۔ مگر جو چھوٹی تھی وہ مجھے بڑی اچھی لگی۔ میں بھی اسے بہت پسند تھا وہ مجھے کہتی کہ تم مجھے بچا پیار دو۔ جو میرا نجھے والا پیارہ تھا۔ میں بڑا حیران ہوتا۔ پھر وہ بھی مجھے اچھی لگنی شروع ہوئی اور پھر میں نے اس کی ماں سے کہا کہ میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بولی یہ تم پر حلال نہیں۔ اور ... اور .... اسے خاموش ہوتا دیکھ کر میری محویت ٹوٹ گئی۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا۔ تمہارا بیاہ نہیں ہوا ؟

"نہیں میں نے مولوی جی سے پوچھا۔ کہنے لگے تم بڑے پاپی ہو۔ ماں دھی کے ساتھ برا کام کیا اور دھی کے ساتھ بیاہ کرنا چاہتے ہو۔ کُتّے کُتّے۔" اچانک وہ زور سے چلایا۔ اور اس کتے کو جو لٹی کے پانی میں سے نکل کر ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے اپنا جسم چھنڈ رہا تھا۔ دوڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھ پر وہ حرام ہے لیکن سب کچھ ان کی ماں کراتی ہے۔"

"میں حیران ہوں کہ تم یہ سب کچھ کیسے کرتے تھے۔"

"کیسے کرتے تھے۔ واہ میاں سب کے سامنے۔ وہاں کیا شرم تھی۔" اس نے ڈبل سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

"مگر ان کا باپ یا بھائی نہیں ہوتا تھا۔"

"وہ تو باہر دورے پر رہتے۔ کبھی کبھار آتے پیچھے سے ہم عیاشی کرتے۔ اگر بھائی یا باپ ہوتا تو یہ سال ہوتا ــــ؟؟

نگرانی نہیں کی ناں، تبھی تو یہ حال ہوا ہے۔ اور پھر وہ اب بھی ــ اچانک اپنی بات پوری کئے بغیر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانا چاہا، کہاں چلے، بات تو پوری کرو؟

"ن۔ نہیں نہیں مجھے جانے دو گھر۔ میری بہن بھی اکیلی ہے ماں بھی نہیں۔ چھوڑ دو مجھے جانے دو" اس نے جھٹکا مار کر ہاتھ چھڑا لیا۔ اور کمان میں سے نکلے تیر کی سی سرعت کے ساتھ بھاگتا ہوا اندھیروں میں غائب ہو گیا۔

خوشبو کا زہر

میری جیب میں صرف تیرہ آنے ہیں اور مجھے واپس شہر بھی جانا ہے لیکن مجھے اپنے مرحوم باپ کی قبر پر اگر بتیاں بھی سلگانی ہیں تیرہ آنے جن میں سے میں ایک پائی بھی خرچ نہیں کر سکتا لیکن مجھے اگر بتیاں ضرور سلگانی ہیں اس لئے کہ میرے باپ کو جسے ڈاکٹروں کی لاپرواہی کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی زمین نے نگل لیا ہے، خوشبو سے محبت تھی۔

میں اس کی روح کو خوش کرنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ اپنی زندگی میں اپنے لباس اور ماحول کو معطر رکھتا تھا۔ اس کا کمرہ رنگا رنگ پھولوں کی دلفریب خوشبوؤں اور اگر بتیوں کی مہک سے چھلکتا رہتا۔ اور آج میں دو سال بعد اپنے دل میں کئے ہوئے عہد کو پورا کرنے کے لئے اس کی قبر پر دعا کے پھول چڑھانے اور خوشبو پھیلانے آیا ہوں۔

دعا اہم ہے مگر مجھے خوشبو دعا سے اہم لگتی ہے ــــ لیکن اگر بتیوں کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ــــ اور دعا کے پھول بے رنگ اور بے مہک ہوتے ہیں ــــ مجھے پیسوں کی کمی کا احساس بری طرح ستا رہا ہے۔

کاش میں نے راستے میں غلطی سے فضول خرچی نہ کی ہوتی ــــ میں ادھار نہیں لے سکتا کہ میری حیثیت کا سنہرا بھرم ٹوٹ جائے گا۔ میں اپنی بہن سے جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے نہیں مانگ سکتا۔ اس لئے کہ اس نے مجھ پر پہلے ہی بہت احسان کئے ہیں اور پھر میں نے تو اسے آج تک ایک پائی بھی نہیں دی۔ سوائے شادی کے موقع پر اس شیشے کے، جو لاٹری میں نکلا تھا

ور پھر وہ بیوہ بھی تو ہے۔ اس کا شوہر اسے شادی کے ایک سال بعد تنہا چھوڑ کر دھرتی کے
ے میں جا چھپا ـــــ ایک اور قبر ـــــ لیکن مجھے اس کے شوہر کی قبر پر اگربتیاں نہیں جلانی۔

تو صرف اپنے باپ کی روح کو سکون پہنچانا ہے۔

جانے یہ احساس مجھے کیوں دیمک کی طرح کھائے جا رہا ہے کہ میرے باپ کی روح مجھ سے
ہے لیکن اب مجھے امید نظر آ رہی ہے کہ میں اسے خوش کروں گا۔ میں سوچ کی تنگ اندھیری گپھاؤں
سی روشن راہ کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں: "تم کچھ مغموم نظر آ رہے ہو"؟ میری بہن
دوستوں کے سے پیار اور ماں کے سے شفقت بھرے انداز میں پوچھتی ہے ـــ میرا ہاتھ تیرہ
ں پر سختی سے جم جاتا ہے۔ "سفر کی تکان ہے۔" میں بے چین آنکھیں جھکا کر جواب دیتا ہوں
ری جانب چائے کی پیالی بڑھاتی ہے۔ میرا ہاتھ جیب سے نہیں باہر آتا اور میں بائیں ہاتھ
پیالی تھام کر دائیں ہاتھ میں دبے سکوں پر گرفت مضبوط کر دیتا ہوں۔
"آج تم چلے جاؤ گے؟ اس کے لہجے میں ٹھہر جانے کی التجا ہے۔ "اتنی مدت بعد تو آئے
چند دن رک جاؤ۔"

"نہیں میں آج واپس جاؤں گا۔ اسی وقت۔" میں بے چینی سے جواب دیتا ہوں۔
"قبر پر گئے تھے؟" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھتی ہے۔
ے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میرے کھوکھلے وجود کو ڈھول کی طرح پیٹ رہی ہو۔
بس اب جاؤں گا۔ میں ڈرتے ڈرتے کہتا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ تم اپنے باپ
پر خالی ہاتھ کیوں جا رہے ہو۔ میں بے بسی سے اپنی خوفزدہ نگاہوں کو در و دیوار پر
ہوں اور پھر صحن میں بندھی گائے کو عجب بے تکے انداز میں گھورنے لگتا ہوں۔
گائے اس کے جواں مرگ شوہر کی نشانی ہے وہ میری آنکھوں میں تیرتے جذبوں کا مفہوم
ہے اور تب میں جلدی سے اپنا چہرہ اس کی جانب گھماتا ہوں تو وہ مجھے آسمان کی جانب
نظر آتی ہے۔ اس لمحے مجھے یوں احساس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی نگاہوں کی کند چھری سے
پردوں کو پھاڑ کر خدا کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی۔ کند چھری واپس اس کے ڈیلوں پر آ گئی ہے اور نارسائی کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

نہ جانے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ ہم خاموشی کی چادریں اوڑھے اپنے آپ میں گم بیٹھے ہیں مگر اس دوران میرا ہاتھ لمحہ بھر کے لئے بھی نیرہ آنوں پر ڈھیلا نہیں ہوا۔

"جا کر خط تو لکھو گے ؟" سکوت کا کچا دھاگہ زبان کی تیز کٹار سے کٹ جاتا ہے۔

"ہاں ـــــ" میں جھوٹی تسلی دے کر اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"سب کو میرا سلام دینا" وہ مجھے اٹھتے دیکھ کر میرا ساتھ دیتی ہے۔ ہم چپ چاپ سر جھکائے دروازے تک چلے آتے۔ اب ہمارے درمیان گھر کی آخری دہلیز داخل ہو گئی ہے۔

میں سرد بے جان آنکھوں سے اس کے ڈھلتے جسم کو دیکھتا ہوں۔ شاید میں اسے آخری بار دیکھ رہا ہوں میں کچھ سوچنے لگتا ہوں مگر وہ اپنا بازو پھیلا کر میری سوچ کا راستہ روک دیتی ہے اور اپنی بند مٹھی کھول کر کہتی ہے ـــ

"یہ رکھ لو ..... راستے میں کام آئیں گے"

شاید اس نے میری جیبوں کا راز پا لیا ہے۔ میں ہتھیلی پہ رکھے نوٹوں کو زبانیں نکالے اپنی جانب بڑھتے دیکھتا ہوں۔ کوئی چیز میرے اندر زور سے کلبلاتی ہے" نہیں میرے پاس بہت ہیں۔ کہیں سے آواز آتی ہے جو میری نہیں کیونکہ میں اس کی ایسی پیشکش اکثر کو قبول کرتا رہا ہوں۔ وہ اصرار کرتی ہے اور کہیں سے آتی ہوئی آواز نہ میں مسلسل انکار ہوتا ہے اور میں ان دونوں آوازوں کو میٹھی لڑائی لڑتے چھوڑ کر ٹیڑھی میڑھی گلی میں چلنے لگتا ہوں۔

دور گلی کے موڑ پر گردن گھما کر دیکھتا ہوں وہ ابھی تک مجھے دیکھ رہی ہے اور جب میں نگاہوں کی فصیل پھلانگ جاؤں گا تو وہ میرے قدموں کے نقوش دیکھ کر لوٹ جائے گی۔ میری بہن دکھیا اور مظلوم مگر محبت کرنے والی ہے۔ میں اپنی بڑبڑاہٹ خود ہی سنتا ہوں۔ میں مضطرب ہو گیا ہوں یہ اضطراب شاید کسی دوسرے کا دکھ محسوس کر کے پیدا ہوتا ہے ہر قدم کے ساتھ میری سوچ کا تانا بنتا ہے۔ اور نیرہ آنوں پہ میری گرفت کبھی نرم کبھی سخت ہوتی ہے۔

مجھے اگربتیاں بھی جلانی ہیں ـــــ میں کئی گلیاں عبور کر آیا ہوں۔ اس وقت دونوں اطراف کچے مکانوں کی قطاریں شکستہ بنیادوں پر گرنے اور نہ گرنے کے درمیان اٹکی ہوئی ہیں۔ ان کے بچکے اور پھولے ہوئے وجودوں سے گذرتے لمحوں کی بُو ساری گلی میں پھیل رہی ہے یہ بُو مجھے خوشبو کا احساس دلاتی ہے۔ میری سوچ خوشبو کے منبع پر آ کر رک گئی ہے۔ منبع جو اگربتیاں ہیں۔ میں تو اگربتیوں کے بغیر باپ کی قبر پر جا رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کلاس میں پڑھاتے ہوئے میرے کسی نالائق مگر شریر شاگرد نے میری کسی خامی کو سب کے سامنے ننگا کر دیا ہو۔ میں ذلت سے ہاتھ جیب سے باہر نکالتا ہوں، مٹھی کھولتا ہوں اور پیسے گننے لگتا ہوں۔

یہ زیادہ نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک آنہ، اگر ایک آنہ نہیں تو صرف ایک پیسہ صرف ایک اگربتی مگر نہیں ایک اگربتی بھلا کیا خوشبو دے گی ـــ کہیں میرے باپ کی روح، اپنی توہین پر بپھر نہ جائے ـــ نہیں میں بہت سی اگربتیاں جلاؤں گا۔ میرے لئے اگربتیوں کا جلانا اتنا ہی اہم ہوا جا رہا ہے جتنا کسی پرجوش حاجی کے لئے روضے کی جالیوں کو بوسہ دینا۔ میں سر جھٹک کر اس خیال کو دیواروں پر دے مارتا ہوں کہ میں اگربتیاں نہیں جلا سکتا ـــ میں ایک موڑ مڑ رہا ہوں۔ سامنے ایک گھر کا صحن نظر آ رہا ہے۔ دروازے کے پٹ اس انداز سے کھلے ہوئے ہیں کہ دیوار کا حصہ الگ ہے۔ اندر نیم کا پیڑ گھنی چھاؤں پھیلائے کھڑا ہے۔ مگر میں نیم کے پیڑ کو تو نہیں دیکھ رہا۔ میں تو اس عورت کو دیکھ رہا ہوں جس کا چہرہ دوسری طرف گھوما ہوا ہے اور جو اپنا سینہ ننگا کئے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ اس کے قدموں کے پاس ہی دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ گھر کا محافظ کتا بیٹھا ہے جو مجھے قریب آتا دیکھ کر چوکنا ہو گیا ہے۔ میں دور ہی سے اپنی نگاہیں عورت کے سینے میں بھتی کا ریزوں میں گاڑ دیتا ہوں۔ میں ایک ہیجان سا محسوس کرتا۔ میں ایک دودھ پیتا بچہ نہیں بن سکتا؟ عورتیں صرف بچوں کو کیوں دودھ پلاتی ہیں! یہ سوچیں میرے اعصاب پر کیوں ناچ رہی ہیں! میرے اندر یہ بھنور کیوں ابھر آیا ہے!

میں اپنی نظروں کا ریزوں سے کیوں نہیں ہٹا سکتا! میرا سانس کیوں مر رہا ہے! میرے حواس کی بنیادیں کیوں ٹوٹنے لگی ہیں! لاحول ولا قوۃ۔

میں جلدی سے سر جھٹکتا ہوں۔ اس لمحے شرم اور گھبراہٹ کی لہر میرے رگ و پے میں حلول کرنے لگتی ہے۔ کتا میری نیت بھانپ کر بھونکنے لگتا ہے۔ اس کی دم اس کی آواز کے ساتھ ہل رہی ہے وہ غضبناک آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا ہے۔ اس کے کھلے جبڑے نفرت کا جھاگ چھوڑ رہے ہیں وہ مجھے دیکھ کر بھونکا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ آخر اسے حق پہنچتا ہے۔ اس نے میرے اندر دشمنی اور رزالت کی بو سونگھ لی ہوگی۔

آخر وہ کسی انسان پر بھونکا ہے کسی کتے پر نہیں۔ انسان جو آج کل کسی کا دوست نہیں اور پھر ہم میں کئی جبلتیں ایک جیسی بھی تو ہیں۔

میں اپنے لڑکھڑاتے قدموں پر قابو پاکر گلی مڑتا ہوں۔ دوسرا موڑ ایک سیدھی گلی کو اگل رہا ہے میرا ہاتھ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ پیسوں کی حفاظت کرتا ہے۔

چند سیکنڈ قبل میں اگربتیوں کو فراموش کر چکا تھا۔ مگر اب مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے ارد گرد خوشبو بکھری ہوئی ہو۔ لیکن میں اسے پکڑ کر اور اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر اپنے باپ کی قبر پر نہیں بکھیر سکتا۔ میں گذرے ہوئے لمحوں کو اپنے عقب کی گلی میں دم توڑتے محسوس کرتا ہوں۔ طویل گلی سنسان ہے۔ میرے قدم تیزی سے اٹھ رہے ہیں۔ سامنے ایک دوکان نظر آ رہی ہے جیسے کسی تباہ شدہ بستی میں محفوظ معجزہ۔ میں دوکان کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ اس کے پاس یقیناً اگربتیاں ہوں گی مجھے خرید لینی چاہئیں۔ مگر واپسی کا کرایہ؟ کون پاگل تمہیں کم پیسوں میں بس پر بٹھائے گا؟۔ شاید ایسا کوئی پاگل مل جائے۔ جو حقیقت میں پاگل نہ ہو" واپسی کا سفر، سرد اندھیری رات، پیسوں کی کمی "خدا کی قسم میں ضرور آج ہی اپنے باپ کی قبر پر اگربتیاں جلاؤں گا — میرے باپ نے مجھ پر بہت احسان کئے ہیں اور میں اس کی موت کے بعد اس کا بدلہ چکا رہا ہوں"۔ میں پھر کبھی آکر پھولوں کی چادر چڑھا دوں گا۔ اور ڈھیروں اگربتیاں بھی" — "تم ساری حیاتی ان کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔ جس نے آج کچھ نہیں کیا وہ کل کیا کرے گا" — وہ طنز کا تیر چلاتے ہوئے کہتا ہے۔

میں جھنجلا کر کہتا ہوں —— "تم چپ نہیں رہ سکتے، خبیث؟"

"نہیں —— وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہتا ہے —— "میں چپ ہو گیا تو تم بھی خاموش

ہو جاؤ گے مجھے تو اپنے باپ سے کیا ہوا عہد پورا کرنا ہے"۔ میں جواباً خاموش رہتا ہوں۔ مگر جب وہ مجھے چڑانے کے لئے قہقہہ لگاتا ہے تو میں اس کو مارنے کے لئے ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑتا ہوں تو میری ٹائی کی گرہ ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

میں دکان سے آگے نکل آیا ہوں۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک بگڑتے بنتے نقوش کا چہرہ نظر آنے لگا ہے۔ جوں جوں ہم دونوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اس کے نقوش ایک پرانے شناسا کی صورت میں ڈھل رہے ہیں۔ اور اب وہ بالکل قریب آچکا ہے۔ اس کے چہرے پر آشنائی کی مسکراہٹ ہے۔ اس نے اپنے قدم روک لئے ہیں۔

"کہو کیسے ہو؟" وہ ہاتھ بڑھا کر بے تکلفی سے پوچھتا ہے۔

میرا ہاتھ جیب سے نہیں نکلتا۔ اور بدن کپکپانے لگتا ہے ——— "جی رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے"۔ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ کیونکہ نہ تو میں جی رہا ہوں اور نہ خدا کا شکر بجا لا رہا ہوں ——— کیونکہ میرے پاس اگر بتیوں .....

"آج کل کہاں ہوتے ہو؟" وہ اپنے پیلے دانتوں کو ہونٹوں کے سائبان تلے سے نکال کر پوچھتا ہے

"وہیں پرانی جگہ ——— میں تیرہ آنوں کو مزید دباتے ہوئے کہتا ہوں۔

"کیا کرتے ہو آج کل؟" اسے باتیں کرنے میں مزا آرہا ہے اور میں اس ماحول سے فرار چاہتا ہوں۔

"پڑھاتا ہوں"۔ میں آہستہ سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے ہولے سے کہتا ہوں۔

"کس کو؟"

میں اکتا چکا ہوں۔ اس کی بات کا بوجھ اب نہیں سہارا جاتا۔ میں چلنے لگا ہوں۔ مگر نہیں میں اس کے پاس کھڑا ہوں۔ اور وہ اپنے جواب کا منتظر ہے۔ شاید کوئی اور چیز میرے اندر سے چلی تھی ——— "حیوانوں کو!" میں کہنا چاہتا ہوں، مگر نہیں میں یہ کہوں گا۔ اتنی بڑی سچائی کا سامنا وہ نہیں کر سکے گا میں جلدی سے آگے بڑھتا ہوں اور رخصتی سلام کئے بغیر کہتا ہوں "بچوں کو" وہ بھی سُنے بغیر آگے بڑھتا ہے۔ اور میں خود اپنے الفاظ فضا میں پھیلتے، کانوں میں اترتے محسوس کرتا ہوں۔ پڑھاتا ہوں معصوم فرشتوں کو جانور اور شیطان بنانے کے لئے میری رفتار اس بازگشت سے زیادہ تیز ہو چکی

ہے جو میرے عقب میں گونج رہی ہے۔

میں کھلے میں نکل آیا ہوں۔ گاؤں کی گلیاں بہت دور ہو چکی ہیں۔ میرے قدموں تلے وہ راستہ پیچھے کی سمت دوڑ رہا ہے جو قبرستان سے آتا ہے اور قبرستان کو جاتا ہے۔

سامنے درختوں کی اوٹ میں سورج ڈوبنے چلا ہے۔ فضا میں اس کی کرنیں یوں دکھائی دے رہی ہیں جیسے انہیں کوئی خوفزدہ کر رہا ہو۔ دن کی روشن آنکھ دھیرے دھیرے بند ہو رہی ہے۔ بس جانے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے اور مجھے اڈے تک پیدل جانا ہے اور اس دوران سورج بھی ڈوب جائے گا۔

درختوں کے سائے کتنے طویل ہو چکے ہیں۔ خود میرا اپنا سایہ بھی کہیں گم ہو گیا ہوگا۔ یہ درخت تو ابھی سے اندھیرے میں لپٹے الجھے رات کا جالا بن رہے ہیں۔

قبرستان آگیا ہے۔ نہیں میں قبرستان میں آگیا ہوں اور میرا ہاتھ بدستور تیرہ آنوں پر جما ہوا ہے اور اگربتیاں!

مجھے لگتا ہے کہ میرا سایہ مجھے اکیلا چھوڑ کر انہی ان گنت سایوں سے مل گیا ہو جن کی کوکھ سے اندھیرا پھوٹے گا —— میرے سامنے ایک قبر آتی ہے اور میں غیر ارادی طور پر اس کے اوپر سے گذر جاتا ہوں میں بوکھلا چکا ہوں۔ یہ تو بے حرمتی ہے۔ میں واپس اس قبر کے اوپر سے گذرتا ہوں۔ پہلی جگہ پر آ کر اس کے ایک طرف سے ہو کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ یہ بے حرمتی کا کفارہ تھا یعنی دوبارہ اس کے اوپر سے گذرو! گناہ کا کفارہ کیا گناہ ہی سے ادا ہو سکتا ہے؟ میں بھی بعض اوقات کیسی باتیں سوچتا ہوں۔

میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔ میں تو اس وقت صرف کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یعنی وہ جنگلی پھول جو میرے دائیں ہاتھ کی انسانی وجود کی کھاد آلود مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ خوشبو! شاید اس میں خوشبو ہو۔ مگر مجھے اگربتیوں کی خوشبو چاہیئے —— انسانی پھول کی بو نہیں جو اس پھول کی پتیوں سے جھانک رہی ہے۔

لیکن مجھے یاد ہے۔ میں ابا مرحوم کی روح کو جو میرے باپ کی ہمشکل تھی، خواب میں اکثر دیکھتا تھا۔ کہیں میرے باپ کی روح مجھ سے خفا نہ ہو جائے۔ میں اگربتیاں ضرور سلگاؤں گا۔ آج نہیں تو پھر کبھی بھی

مجھے اس وقت لوٹ جانا چاہئیے ــــــ مگر میں ٹھہر جاتا ہوں۔ کوئی بوجھ میرے کندھوں پر آگرا ہے۔ جو چلنے نہیں دیتا۔ مڑنے نہیں دیتا۔

"میرے پاس تو اگربتیاں ہیں میں تجھ سے پہلے جا کر جلاؤں گا"۔

"میں بھی سلگاؤں گا": میرے ہونٹ پھڑپھڑاتے ہیں۔ وہ پھر لوٹ آئی ہے۔

"ہونہہ، تم!ــ" وہ نفرت کا جھاگ اگلتے ہوئے کہتا ہے ــــ "تم واپسی کے سفر سے خوفزدہ ہو حالانکہ ہر ایک کو واپس جانا ہے۔ اور پھر نہ تمہارے پاس پھولوں کی چادر ہے کہ قبر پر چڑھاؤ، نہ دیا ہے قبر پر جلانے کے لئے، اور نہ واپسی کا تاریک سفر کاٹنے کے لئے کوئی اگربتی ہے جو اس بو کا مداوا بن سکے جو تمہارے اندر ہے۔ تم تو اپنے اندر سے بدبودار اور کھوکھلے ہو۔ تم ماضی کی ان زندہ یادوں کو کیا قائم رکھ سکو گے۔ تم جو اپنی مٹھیوں میں سانپ اور بچھو جکڑے ہوئے ہو۔

وہ میرے منہ پر تھوک دیتا ہے۔ میری مٹھی میں مقید کوئی شے مجھے کاٹ رہی ہے میں دوسرے ہاتھ سے پسینہ پونچھتا ہوں۔ یہ تھوک ہے یا پسینہ؟ شاید پسینہ ہے جو اس سردی میں خوف کی آگ سے تپ کر مساموں کی راہ سے باہر رس آیا ہے۔

میں اگربتیاں ضرور سلگاؤں گا۔ میں اسے پرے دھکیل کر تیزی سے آگے بڑھتا ہوں قبریں سنگ میل بن کر مجھے راہ دکھا رہی ہیں۔ میری جیب میں سکوں کی کھنک ابھرتی ہے میں دھیرے سے ہاتھ باہر نکالتا ہوں اور پھر دوبارہ جلدی سے ہاتھ جیب میں ڈال کر انہیں اپنی الجھی لکیروں والی ہتھیلی میں جکڑ لیتا ہوں۔

میں اپنے باپ کی قبر پر پہنچ چکا ہوں ــــــ میرا باپ مر چکا ہے مگر زندہ ہے۔ میرا باپ جو خاموش ہے۔ مگر بول رہا ہے۔ میرا باپ جو میرے اندر بھی ہے اور میرے بعد آنے والوں کے اندر بھی ہو گا۔ جیسے لمحے سے لمحہ جنم لیتا ہے۔ ایسے ہی آدم سے آدم جو کبھی نہ مرے گا اور ایک دن اپنی مجبوریوں کو مارے گا۔ آدم جو زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اگر کُل کی صورت میں نہیں تو جزو کی صورت میں ــــــ میں اسے اپنے اندر محسوس کر رہا ہوں۔ مگر مجھے تو کُل کو خوش کرنے کے لئے اگربتیاں جلانی ہیں۔

میں بڑی خشکی سے جیب سے ہاتھ نکالتا ہوں۔ سکے آزاد ہو چکے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ میں ہاتھوں

کا پیالہ بنا کر دعا مانگتا ہوں ـــــ کئی دنوں بلکہ کئی ماہ سے میرے ہاتھ دعا کو نہیں اٹھے۔ میرے ذہن میں اُگی دعاؤں کی ہری فصل سوکھ چکی ہے۔ اب میں کیا مانگوں۔ اپنے باپ کی رُوح کا سکون یا اپنا سکون لیکن میں یہ سکون کس سے مانگوں۔ میں تو دینے والے کو بھُول چکا ہوں۔

کسی کے قدموں کی آہٹ گویا میرے ہونٹ پکڑ کر ہلانے لگی ہے۔ میری آنکھوں نے سامنے چند گز کے فاصلے پر ایک پرچھائیں دیکھ لی ہے اور میرے ہونٹ خود بخود ہلنے لگے ہیں۔ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ کوئی بنجر دعا! میں کس سے مانگ رہا ہوں؟ خدا سے!

میرا جی چاہتا ہے کہ زور کا قہقہہ لگاؤں۔ اتنے زور کا قہقہہ کہ ہوا کا رخ بدل جائے چاروں طرف کھڑے درخت اپنی جڑوں سے اکھڑ کر ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔ ڈوبتا ہوا سورج آدھے آسمان پر لوٹ آئے۔ زمین کا سینہ پھٹ جائے اور قبروں میں پڑے مردے ہڑ بڑا کر اٹھ بھاگیں اور میرا باپ غصّے میں آ کر میرا کان پکڑ کر کہے "حرامزادے نیند خراب کرتا ہے"۔

میں آنکھیں بند کرتا ہوں اور جلدی جلدی ہونٹ ہلانے لگتا ہوں۔ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ میرے پاس تیرہ آنے ہیں۔ مجھے واپس شہر جانا ہے اگر بتیاں بھی جلانی ہیں۔ بے بی کے پھٹے پاؤں کے لئے ویسلین خریدنی ہے اور بیمار بیوی کے لئے دوا بھی، نہیں مجھے کچھ نہیں کرنا ہے صرف اگر بتیاں جلانی ہیں میرے ہونٹ اور آنکھیں ایک ساتھ اپنی فطری حالت میں لوٹ آئے ہیں۔ لیکن مجھے کس کے لئے اگر بتیاں جلانی ہیں؟ زندوں کے لئے یا مردوں کے لئے؟ جو زندہ ہیں انہیں مردوں سے زیادہ ان کی ضرورت ہے میں ٹکٹکی باندھے قبر کے ابھار کو یوں دیکھ رہا ہوں جیسے منوں مٹی تلے دبا ہوا بے جان لاشہ میری کیفیت سے آگاہ ہو کر ابھی باہر نکل آئے گا۔

میں بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں قبر سے ہٹاتا ہوں اور اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں۔

سناٹا اتنا گھنا ہے کہ مجھے اپنا سانس کسی غیر کے منہ سے خارج ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

مگر اس سناٹے میں ایک نئی اور عجیب چیز بھی شامل ہو رہی ہے۔ میرے بائیں ہاتھ پر جہاں پختہ قبروں کا ایک سلسلہ جھاڑیوں تک چلا گیا ہے ـــــ ایک عورت سیاہ لبادہ اوڑھے ایک قبر پر جھکی پھُول بکھیر رہی ہے۔ قبر کے عین وسط میں دھوئیں کی لپٹیں بلند ہو کر خوشبو پھیلا رہی

ہیں۔ ایک مہک چاروں جانب رقص کر رہی ہے۔ عورت اپنے فریضے سے فارغ ہو کر خوشبو کے دھوئیں میں راستہ بناتی واپس جا رہی ہے۔

اس کو بھی اگربتیاں دیتی جاؤ ——— وہ پھر میرے قریب آ کر کہتا ہے۔

عورت درختوں کے عقب میں اندھیرے کا حصہ بن گئی ہے اور وہ میرے قریب کھڑا حقارت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میری آنکھیں غصے اور نفرت سے جلنے لگی ہیں لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور میں مجبور ہو کر دعائیں پڑھنے لگتا ہوں۔ جھوٹ موٹ کی دعا ——— میرے باپ کی روح کو سکون نصیب ہو اور ہمارے لئے؟ ہمارے لئے یہ دنیا دوزخ بنی رہے۔ ان مردوں کو راحت اور مہک نصیب ہو اور ہمیں؟

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے باپ کی روح مجھ سے خفا ہو گئی ہے۔ آخر وہ خوشبو کا رسیا تھا۔ اسے اگربتیوں کی مہک چاہیئے۔ مگر میں کہاں سے لاؤں۔ میں کرائے کی رقم بڑی احتیاط سے جیب سے نکال کر گنتا ہوں اور پھر واپس جیب میں رکھ دیتا ہوں۔

اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا ہے اور میں قبر کے سرہانے آ کھڑا ہوا ہوں کہ شاید میرا باپ مجھے دیکھ نہ پائے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں بہت بڑا جرم کر کے آیا ہوں۔ بھاگنا چاہتا ہوں بھاگ نہیں سکتا "جب تک تم اگربتیاں نہیں جلاؤ گے میں تمہیں نہیں بخشوں گا" وہ خبیث پرے کھڑا مجھے گھورتے ہوئے کہتا ہے۔

اگربتیاں! اگربتیاں!! میں کرب کے بھنور میں ہچکولے کھانے لگا ہوں۔ خوشبو کا زہر میری نس نس میں اترنے لگا اور میں تریاق کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ اچانک میری نگاہ سامنے قبر پر جا رکتی ہے۔ جہاں بہت ساری اگربتیاں سلگ رہی ہیں۔ میں ان کی جانب دوڑنے لگا ہوں وہ میری ہتھیلیوں میں آیا ہی چاہتی ہیں اور اب میں انہیں قبر سے نوچ رہا ہوں۔ وہ میرے ہاتھوں میں آ چکی ہیں۔ میں پہلے سے زیادہ رفتار کے ساتھ ——— پلٹتا ہوں۔ مٹھی کھول کر سلگتی اگربتیاں اپنے باپ کی قبر کے سینے میں گاڑ دیتا ہوں۔

خوشبو چاروں جانب لہریں مارنے لگی ہے ——— میرا ہاتھ جیب میں پڑے سکوں پہ جا گرتا

ہے اور میں قلانچیں بھرتا ہوا اس کچے راستے پر دوڑنے لگتا ہوں، جو واپس میری بے نام منزل کو جاتا ہے۔

بگولہ

چاروں طرف پھیلی چھتوں پر رنگوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ عورتیں اپنے ٹھٹھرے گھروں کی دیواروں سے چمٹی نمی کا وجود توڑنے کی خاطر کرنوں کی حدت چوس رہی تھیں ـــــ اسے کوئی بھی چھت عورت کے وجود سے خالی نظر نہ آئی۔ چھوٹے چھوٹے بچے، جوان لڑکیاں اور ادھیڑ عمر عورتیں ان گنت رنگوں کے لباسوں میں ڈھکی آسمان کے نیلے نیلے شفاف تنبو تلے بسیرا کئے بیٹھی تھیں۔

اس کا گھر محلے کے اس کونے میں تھا جس کے عقب میں ایک سڑک پل کے پاؤں پکڑے دور تک لیٹی ہوئی نظر آ رہی تھی اور سامنے جدھر اس کی نگاہ تھی دُور دُور تک محلے کے بے ترتیب مکانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

اچانک اس کی نگاہ مکانوں میں سُرنگ بناتی شہر کی سڑکوں پہ دوڑنے لگی اور آخرکار اس سڑک پہ جا ٹھہری جسے پکڑ کر وہ روزانہ دفتر جاتا اور سارا دن فائلوں کی دھول سے رزق چھنتا اور جونہی شام کا پچھلا پہر آنکھ پھیلاتا وہ سڑک اسے گود میں اٹھائے گھر لا چھوڑتی۔

صرف چھٹی کے دن سڑک کا رشتہ اس سے ٹوٹتا۔

یہ دن اس کے لئے ایک غیر معمولی دن ہوتا۔ اس دن اس کی زندگی کے فریم میں لگی تصویر کے رنگ نکھر آتے اور نقوش جاگ اٹھتے ـــــ اور اسے احساس ہوتا کہ اس کا رشتہ اس پتھریلی سڑک کے علاوہ بھی کسی شے سے ہے۔

چھٹی کا دن وہ چھت پہ گزارتا، دھوپ اور سائے کا کھیل کھیلتا اور اپنی بہن سے باتیں

کرتا۔ ان کی گفتگو گھر سے شروع ہوتی، شہر بھر کی دلچسپی اپنے نقطوں کی جھولی میں سمیٹتی اور محلے کے در و دیوار کا حال پوچھتی۔ اور واپس اپنے گھر کی دیوار پر آ بیٹھتی۔ لیکن اس ساری گفتگو میں وہ اپنا اور اپنی بہن کا ذکر نہ کرتا۔ وہ دونوں اپنے بارے میں ذرا سی بات کہتے ہوئے بھی جھجک جاتے۔ لیکن اس کی بہن بار بار اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتی اور جب وہ خاموش ہو جاتا تو وہ سفید بالوں کا ایک گچھا انگلیوں میں پھنسائے اُٹھ کھڑی ہوتی اور اسے دیوار سے پرے پھینک دیتی۔

شروع شروع میں تو وہ اس حرکت کا مفہوم نہ پا سکا لیکن ایک روز آئینہ دیکھتے وقت اس کے ڈیلوں پر وہ گچھا آ گرا۔ بڑی مشکلوں سے ایک ایک کر کے اس نے وہ بال اپنی آنکھوں سے نکالے ـــ اس دن کے بعد اس نے بہن سے بات چیت مختصر کر دی اور اس نے بھی کچھ محسوس کرتے ہوئے چھت پر چڑھنا چھوڑ دیا۔

آج وہ نیچے باورچی خانے میں چولہے کے آگے بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی تو اس نے چھت سے نیچے جھانک کر دیکھا اسے یوں لگا جیسے وہ دونوں بہن بھائی اس گندھے ہوئے آٹے کی طرح ہیں جسے پکنے کے لئے حرارت نہ ملی ہو۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے نظریں موڑ لیں اور پرے ہٹ گیا۔ چھتوں پر پھیلے رنگوں کے پیوند اسے اشارے کرنے لگے۔ اس کی نگاہ ایک ایک رنگ کو کھنگالتی اونچی نیچی منڈیروں پر کودتی واپس اپنی جگہ پر آ گئی ـــــــ اس کی چھت کے عین سامنے ایک لڑکی جامنی رنگ کا جوڑا پہنے دھوپ کی چھتری تلے بیٹھی تھی۔ اپنے ہاتھوں میں پکڑے اُون کے گولے میں پیوست سلائیاں نکال کر اس نے انگلیاں ہلائیں اور اوپر دیکھا ـــــــ سامنے کھڑا امراد اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا لیکن نگاہوں کی اٹھان نہ گری وہ اس لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا جو اپنے جامنی لباس میں بہت بھلی لگ رہی تھی اس کے پاس ہی دو بچے مونڈھوں پر بیٹھے کتابوں کو گھٹنے پہ رکھے پڑھنے میں مصروف تھے۔ لمحہ بھر میں اس نے سارے کنبے کو پرکھ لیا اور اب اس کی آنکھیں لڑکی کے سراپے پہ دستک دے رہی تھیں ـــ شمال کی جانب سے آنے والی ہوا میں چھپی ٹھنڈک اس کے کھلے گریبان کو پکڑے سینے پہ ناچ رہی تھی

گلے میں بندھا مفلر کب کا کھل چکا تھا اور سر کے بال سرسراتی ہوا کی ہتھیلی پہ کھیل رہے تھے۔

اچانک لڑکی کو اپنے جسم پہ کسی ہلکے سے دباؤ کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر دوبارہ اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ سامنے والی چھت پہ کھڑا اجنبی اسے نگاہوں کی سیڑھی اترتے اپنی جانب آتا دکھائی دیا اس کے گالوں پہ حجاب نے انگڑائی لی اور ماتھے پہ بل بناتی ہوئی ہونٹوں کے کونوں میں چھپی مسکراہٹ ساتھ لے کر جسم کے نشیب میں اتر گئی۔

تیس برس کے طویل عرصے میں اس نے پہلی بار کسی لڑکی کے چہرے پر اپنے لئے مسکراہٹ کو حجاب کے گھنگرو باندھے ناچتے دیکھا۔ تیس برس کی یہ خشک اداس پگڈنڈی اچانک ایک سرسبز وادی میں آنکلی۔ اس وادی میں اس کی گذری ہوئی ساری زندگی قطار باندھے اسے دیکھنے لگی۔ سالوں کی اس طویل قطار میں سے اس نے اپنا بچپنا مسکراتے دیکھا مگر ایک محدود مسکراہٹ — اور اس کے بعد آنسو ہی آنسو، دوسری تصویر میں وہ اپنی ماں کی موت پر رو رہا تھا۔ اس دن سے وہ مسکرانا بھول چکا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے کئی تصویریں نکالیں، اپنے بڑے بھائی کی تصویر جو اسے اور اس کی بہن کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا تھا اور اپنے مرحوم باپ کی تصویر جو مرتے وقت اسے ایک ہاتھ تھما گیا تھا اور وہ آج تک اس ہاتھ کا سہارا ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ وہ مسکرانا بھول چکا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی انگلیوں سے اپنے لبوں کو زور سے نچوڑا۔

سامنے بیٹھی لڑکی نے اس کے اشارے کے جواب میں اپنا ہاتھ ماتھے پر پھیرا۔ اس کی آنکھیں سرشاری سے چھلکنے لگیں۔ — سورج اپنا آدھا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس کے بطن سے امڈتا گرم اجالا ان گنت لوگوں سے دعائیں لے رہا تھا — بے اختیار اسے زندگی کے لفظ میں نئے معانی سر اٹھاتے نظر آئے

اپنی دفتری زندگی میں وہ ایک شریف اور محنتی آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھی آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ سنا کر اپنی اہمیت کا احساس دلاتے اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان واقعات کا زیادہ حصہ خیالی اور من گھڑت ہے۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ باس کی سٹینو پہ کتنے لوگ گرم ہیں اور کون کون اس سے اپنی خفیہ آشنائی کا دعوے دار ہے لیکن ان باتوں کے باوجود اس کے ساتھی

اپنے چہرے کی جھریوں کو چھپا کر مسکرانے کی کوشش کرتے جو زندگی کے مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی
طرح سلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سارے لوگ صرف مرنے کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں
اسی لئے تو اس نے اپنا یارانہ اس سڑک سے جوڑ لیا تھا جو رفیقِ راہ، اور گھر سے دفتر اور
دفتر سے گھر تک کی شریکِ سفر تھی۔ پتھر کی اس سڑک کے دونوں طرف درختوں میں ہر سو
خزاں نوحے پڑھتی اور اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتی۔ لیکن آج اس سڑک پر ہوا نے نئے گیتوں
کی بیاض کھول دی تھی۔ ٹنڈ منڈ اور گنجے درختوں پہ ہریالی کا نور پھیل گیا اور خشک فائلوں کے
ہندسے زرخیز ہو گئے اور لفظوں کی شاخ پر خوشیوں سے نکھرتا بور آ گیا اور اپنے ساتھیوں
کی جھوٹی باتیں سچ کا سانس لینے لگیں۔ آج تو اس کی پور پور زندگی کے رنگ و بو سے اپنا خراج وصول
کر رہی تھی۔

وہ آہستہ سے دیوار پر جھک گیا اور اپنی باہیں کرنوں کے گلے میں ڈال دیں۔ سامنے بیٹھی ہوئی
لڑکی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کی آنکھوں کے تالاب میں کود گئی، پانی کے چھینٹے اڑے اور
کنارے بھیگ گئے۔ خاصی دیر گزر گئی۔ آخر کار وہ کنارے پر آتے ہوئے بولی۔

"میں تھک گئی ہوں، آؤ آرام کریں۔"

وہ دونوں ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں کیبن کی دیواروں پہ بے شمار نام کھدے ہوئے ہیں کئی
لوگ یہاں آتے ہیں، چوری چھپے کی ملاقاتیں اور اپنے ناموں کی یادگار چھوڑے فاصلوں میں گم ہو
جاتے ہیں۔ اس نے بھی کیبن کی دیوار پہ اپنا نام لکھ دیا۔

وہ اس کے سامنے بیٹھی ہے، جامنی رنگ میں بندھا جسم آہستہ آہستہ کھلتا ہے اور اس
کی تہوں سے ایک بھنورا نکل کر چوکور فضا میں اڑنے لگتا ہے اور آخر کار تھک کر لڑکی کے بالوں
کے پھول دار جوڑے پہ جا بیٹھتا ہے۔ بھنورا پھول کا رنگین رس اپنے حلق سے اتارتا ہے۔

باہر کسی کے قدموں کی چاپ کیبن کی دیوار پر دستک دیتی ہے۔ پھول کی پتی پہ بنے چہرے
کے لب ہلتے ہیں —— "کیا تیری میری زندگی کی سانجھ نہیں ہو سکتی۔؟"

وہ چونک کر پہلو بدلتا ہے اور کرسی چرچرانے لگتی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مسرت

اپنے آخری دموں پہ سسک رہی ہے ——— وہ لڑکی کی آنکھوں میں جھانکنے لگتا ہے۔
بچوں کی آوازیں پلکوں کے در کھولے باہر جھانکتی ہیں۔
"یہ تیرے بھائی ہیں؟" ——— "ہاں؟
کیوں؟
بہت چھوٹے ہیں!"
"تو کیا ہوا۔ میں نے تو اپنا بوجھ خود اٹھا رکھا ہے اور اب تم بھی اس میں ہاتھ بٹاؤ گے۔
"لیکن میں نے تو کسی اور کا بھی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔" وہ سر جھکا کر کہتا ہے۔
دونوں چپ ہو جاتے ہیں۔ لڑکی اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہے اور پھر سفید بالوں کی ایک لٹ نکال کر میز پر رکھ دیتی ہے۔ بالوں کی لٹ میں سے ایک شعلہ سا نکلتا ہے اور وہ چلاتا ہوا باہر بھاگ جاتا ہے۔

اچانک دیوار اس کے وجود کے بوجھل پتھر تلے کانپ اٹھی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جاگتے خوابوں کی دھول لکیر بن کر سامنے چھتوں تک پھیل چکی تھی۔ رنگوں کے سارے پیوند گیلے ہو کر بے رنگ ہو گئے۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ دی اور دوسری منڈھیر کے پاس پل کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا نوکیلے ناخنوں سے سینے کے زخم کھرچنے لگی۔ اس نے گلے کے گرد مفلر لپیٹ کر قمیض کے بٹن بند کئے اور بے چینی سے سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ تھوڑی دیر قبل جو فلم ذہن کی سکرین پہ چل رہی تھی ٹوٹ چکی تھی اور اب دفتر کو جانے والی سڑک، ٹنڈ منڈ بنجر درخت، گرد آلود فائلیں اور بانجھ لفظوں کا طوق تیس سالوں کی دی میں پرویا ہوا اپنے گلے میں لٹکا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ اس طوق کو اتار کر پھینک دے لیکن بہن کی آواز اسے گریبان سے پکڑے نیچے گھسیٹنے لگی۔ وہ اسے کھانے کے لئے بلا رہی تھی۔

وہ ڈیوڑھی میں جا کر رک گیا اور جھریوں سے اندر گھورنے لگا۔ ویران گھر میں تا حتا پالا۔ اور گہری اداسی کے پر باہم مل کر دائرے بنا رہے تھے۔ انہی دائروں میں اس کی بہن پھنسی ہوئی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ اندر جا کر سارے دائرے توڑ دے اور اسے سلامت باہر لے آئے اچانک اسے اپنا وجود چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ دائرے اس پر بھی حملہ زن تھے۔ آسمان پر جلتا سورج تاریک ہو گیا اور چھٹی کا دن پتھر کی سڑک پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنی زبان پر رکھی ہوئی چپ کی کنکری کو دانتوں میں دبایا۔ سارے منہ میں ریت بھر گئی۔ ریت جو سارے جسم میں پھیل کر بگولہ بن گئی۔ کسی نے اسے پھر پکارا — گھر کی دیواروں سے صداؤں کا ایک بگولہ اٹھا اور ساری ریت اڑا کر باہر لے گیا۔
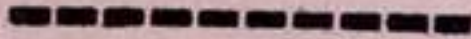
ایک انجانی روگ

نوٹس بورڈ پر ہاتھ سے لکھا ہوا شام کی میٹنگ کا اشتہار لگاتے وقت لقمان کی نظر ان کیلوں پر پڑی جو دیوار سے اکھڑ کر اب لکڑی کے فریم کو ڈھیلا کر چکی تھیں۔ بے دلی سے اشتہار لگا کر اس نے ہاتھوں سے گوند صاف کیا اور اینٹ سے دوبارہ کیلیں ٹھونکنے لگا۔ اس کی ہر ضرب کیل سے زیادہ دیوار کی اینٹوں پر پڑ رہی تھی۔

اسلم نے اسے دیوار پر اینٹ مارتے دیکھ کر کہا۔

"لقمان بھائی چیزیں پرانی ہو کر ناکارہ ہو جائیں تو پھینک دیتے ہیں۔ یونین فنڈ سے نیا نوٹس بورڈ بنا لو یہ تو اتنا پرانا ہو چکا ہے جتنی ٹریڈ یونین کی تاریخ۔"

لقمان نے لمحہ بھر کو ہاتھ روکا۔ بات سُنی اور پھر زور زور سے اینٹ کے وار کرنے لگا۔

تین چار منٹ اسی ٹھک ٹھک میں گزر گئے تو اسلم تنگ آ کر بولا۔

"مجھے کام پر جانا ہے چندے کی رسید دے دو پھر چاہے ساری دیوار گرا دینا۔"

لقمان نے گہری سانس لیتے ہوئے اینٹ پرے پھینکی جو نالی میں جا گری اور جا بجا کیچڑ کے دھبے پھیل گئے۔ لقمان نے کیچڑ کے اس دھبے کو دیکھا جو لفظ شام کی "ش" کا چوتھا نقطہ بن گیا تھا اور پھر پتلون کی جیب میں سے رسید بک نکالتے ہوئے بولا۔

"ہمیشہ جولائی کا چندہ ستمبر میں دیتے ہو لیے تو دیوار نہیں گرے گی۔"

"جولائی کا الاؤنس بھی تو ستمبر میں ملتا ہے۔" اسلم نے رکھائی سے جواب دیا اور رسید لے کر چل دیا۔

اب اس کے سامنے پھر وہی نوٹس بورڈ تھا، وہی نالی میں پڑی اینٹ اور وہی "ش" کا چوتھا نقطہ جو سوکھ چکا تھا۔

اس کا جی چاہا کہ اینٹ سے دیوار کو اس وقت تک کوٹتا رہے جب تک کہ وہ گر نہیں جاتی مگر اس کے اعصاب پر اکتاہٹ بھری غنودگی پھیل رہی تھی اس کا ارادہ آرام کرنے کا تھا مگر کام کی زیادتی کئی دنوں سے اسے سکون کی مخملی وادی میں اترنے سے روک رہی تھی اور اب وہ کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ اور اگر کوئی ہو تو اس کے درد کو سمجھنے والا ہو۔

اس نے دیوار کے ساتھ کہنی ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے جیب ٹٹولی اور نوٹوں کی موجودگی اور تمباکو کا احساس کر کے چونکا اور پھر ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر گلی میں چلنے لگا۔ نکڑ پر لگے کھمبے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور ماچس نکال کر تیلی جلائی۔ ناقص مصالحے کی وجہ سے تیلی بھڑک کر بجھ گئی۔ اس کے دل سے جھنجھلاہٹ بھری گالی نکلی مگر ہونٹوں میں دبے سگریٹ نے اسے باہر آنے سے روک دیا۔ دوسری تیلی سے سگریٹ سلگا کر وہ نوٹ گننے لگا۔

"ایک ..... دو ...... تین ..... چار ...... ساٹھ اور دو ..... نو..... کل نو روپے اور ابھی دس ممبر رہتے ہیں۔" شام کی میٹنگ میں پہلی بات چندے کی ہوگی۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا۔ آخر پوسٹر چھپوانے ہیں۔ اسٹرائک کی تاریخ قریب آ رہی ہے .... عدالت .... عدالت .... ابھی وہ نہ جانے کیا کچھ سوچتا لیکن دھواں اس کے سینے میں بگولے کی مانند چکرایا اور پھر حلق میں کھانسی کا غبارہ پھٹنے لگا۔ کھانستے کھانستے اس نے رقم جیب میں ڈالی اور واپس مڑا ــــ یونین آفس کی دیوار پر آویزاں پرانے نوٹس بورڈ پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ دوسری طرف سڑک پر اتر گیا۔

اسے گھر سے نکلے ساتواں مہینہ ہو چلا تھا۔ ان سات ماہ میں وہ صرف ایک مرتبہ گھر گیا تھا۔ بہن بھائیوں کو اپنے ملازم ہونے کی خبر سنانے اور کلثوم سے چوری چھپے کی ملاقات کرنے۔ لیکن یہ تو تب کی بات تھی جب اسے نوکری ملے ایک ہفتہ ہوا تھا اور اب؟

اب تو اس نے کئی مرتبہ گھر جانے کا ارادہ کیا مگر ہر بار کوئی ہنگامہ ریلوے پھاٹک کی طرح اس

کا راستہ روک لیتا۔

جب سے اس نے آفس سیکرٹری کا عہدہ سنبھالا تھا چندہ لینے کا فرض بھی اس کے ذمہ آپڑا تھا اور اب وہ پیداواری کام کم اور سیاسی کام زیادہ کرتا۔ کبھی کبھی تنہائی میں اسے بے بس دیکھ کر گھر کا تصور اس کی آنکھوں میں چھم چھم کرتا ناچنے لگتا۔۔۔۔۔ گھر اور گاؤں۔ کچے کوٹھے۔ سنسان گلیوں میں گرم دوپہر کی چمکتی زبان۔ میدانوں میں اڑتی دھول۔ کنوؤں کی ریں ریں اور پھر کلثوم سے چوری چوری ملاقاتیں۔ یہ یادیں بادل بن کر اس کے اعصاب پر چھا جاتیں۔ مگر ٹھنڈک کا لطیف احساس یا پانی کا ننھا قطرہ دیئے بغیر یہ بادل گزر جاتا اور وہ کانپتی زبان پر نارسائی کا تصور لیئے ہانپتا رہ جاتا۔ کبھی کبھی تو اس کے من میں آتا کہ گھر اور شہر کے درمیان پھیلے فاصلے کے اس طویل تھان کو اپنے پاؤں کی چرخی سے لپیٹ کر رکھ دے مگر ہنگامی زندگی کا کلہاڑا اس چرخی کو بار بار توڑتا اور ساری باتیں اسے ایسی پرچھائیاں لگتیں جنہیں بند آنکھوں سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

سات ماہ کی مدت میں اسے اپنے کردار کی وجہ سے کافی مقبولیت ملی۔ ٹدل پاس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انتھک کام کرنے والا دیانت دار کارکن تھا۔ لیکن اس پر یہ کیفیت کیوں اور کب سے طاری ہونے لگی۔

ایک خلش اور بوجھل سا غبار دل پر! اپنے جسم کی دیواریں توڑ کر آزاد ہونے کی خواہش! نسوانی خوشبو کی آہٹ پا کر چونک اٹھنا۔!

بے چینی، اضطراب، اپنی دسترس سے باہر [illegible] بیٹھنے کی آرزو۔ مزاج میں بجلی کی تڑپ پھر بھی بے بسی، کم مائیگی اور دکھ بھری تنہائی کے دامن پھیلائے خوف!

پچھلے کئی دنوں سے یونین آفس میں ہونے والی اتوار کی میٹنگ میں چند لڑکیوں نے آنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ تعاون کی ہدایت اسے اوپر والوں سے مل چکی تھیں مگر وہ خود ان کے بارے میں متجسس تھا۔ ورکرز کے علاوہ لڑکیاں بھی بحث میں حصہ لیتیں اور حالات کا تجزیہ کر کے اپنی اپنی آراء سے آگاہ کرتیں۔ ایسے موقعوں پر وہ چپ چاپ اس لڑکی کو تکتا رہتا، جو اکثر اپنے کندھے سے تھیلا لٹکائے رکھتی اور گاہے بگاہے اس میں سے پمفلٹ نکال کر بانٹتی۔

وہ اسے کلثوم کا شہری ایڈیشن معلوم ہوتی۔

ایک دن اس نے جھجکتے ہوئے اسلم سے پوچھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اسلم اسے تنگ کرنے کے ارادے سے بولا۔

"ویسے ہی!" اس کے پاس کوئی معقول دلیل نہ تھی۔

گاؤں میں تمہاری کتنی بہنیں ہیں؟" اسلم اسے چھیڑنے لگا۔

"دو"! وہ سادگی سے بولا۔

"اگر ان کے بارے میں کوئی غیر مرد پوچھے تو؟"

"تم بڑے کمینے ہو ——— میں تو خدا کی قسم بری نیت سے نہیں"۔

"اچھا ناراض مت ہو۔ یہ ری تمہاری طرح کارکن ہیں"۔ اسلم نے کہا۔

اور پھر نرمی سے بولا ——"تم چند دنوں سے کچھ کھوئے کھوئے سے ہو۔ عورت واقعی مرد کی ضرورت ہے مگر کیا کیا جائے۔ اس نظام میں۔ دوسری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں یہ نعمت کہاں میسر مگر تم ادھر چلے جایا کرو ناں!!"

"تم بڑے حرامی ہو۔ میں تمہاری شکایت کروں گا"۔ وہ غصے میں بولا۔

"یار مذاق کر رہا تھا ناراض ہو گئے ہو"۔ اسلم معذرت کرنے لگا۔

اسے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ بے دلیل، بے مقصد بات کہہ کر اپنے دل کا بوجھ بڑھا لیا۔ اس سے تو چپ اچھی تھی۔ گہری چپ۔ اور پھر وہ چپ چپ رہنے لگا۔

کچے پکے مکانوں کی بے ترتیب دیوار کے درمیان آنتوں کی طرح پھیلی گلیوں میں سے گزر کر وہ اس ٹاہلی کے درخت تلے جا کھڑا ہوا جہاں وہ ایک مرتبہ اسلم کے ساتھ آیا تھا اور ناکام واپس گیا تھا۔

درخت کے سامنے کوارٹر نما مکانوں کا ایک مختصر سا سلسلہ نالے کے پل تک پھیلا ہوا تھا۔ پیشہ کرانے والی عورتیں اپنے قانونی ٹھکانوں کے بند ہو جانے کی وجہ سے رزق ڈھونڈتی ہوئی یہاں آ

بسی تھیں۔ آئے دن اس علاقے کے شرفاء مختلف مکتبۂ فکر کے مولویوں کے ساتھ مل کر اس مشترکہ لعنت کے خلاف مراسلے لکھتے بیان دیتے اور جمعہ کے دن مسجدوں میں قرآن و حدیث کے حوالوں سے کوٹھوں اور رنڈیوں کے خلاف تقریریں کرتے۔ کبھی کبھی سماج سدھاریوں کی آواز پر شہری انتظامیہ لبیک کہتی ہوئی حرکت میں آتی اور اس برائی کا خاتمہ کر دیتی۔ مگر تیسرے دن گوشہ نشین ہو جانے والی طوائفیں پھر واپس اپنی غذا بھری ڈالیوں پر آ بیٹھتیں۔ ابھی پچھلے دنوں یہاں پولیس نے چھاپہ مارا تھا پکڑا کوئی نہیں گیا کیونکہ "جو لوگ اونٹوں سے دوستی رکھتے ہیں اپنے دروازے بھی اونچے بناتے ہیں۔"

لقمان نے یہ خبر پڑھی تھی۔ پڑھتا کیوں نا آخر اس کی یونین کے ہڑتال والے بیان کے بالکل اوپر لگی تھی۔ اور اب اسے وہ خبر یاد آ رہی تھی۔ اسی لئے تو وہ ایک دبی دبی سی مسرت کے ساتھ انجانا خوف بھی محسوس کر رہا تھا۔ ابھی اس نے ایک سگریٹ کا کش لگایا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اسے سر کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

لقمان کے اعصاب میں ایک تناؤ پھیل گیا وہ گلی کے دونوں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے آگے بڑھا اور پھر اس عورت کے قریب جا کر رک گیا۔

"ڈر رہے تھے آتے ہوئے باؤجی؟" وہ بولی

"شریف آدمی کو ڈرنا چاہیئے یہاں آتے ہوئے۔" وہ شرمساری سے بولا۔

"آدمی گھر سے نکل آئے تو پھر ڈر کس بات کا ویسے بھی لوگ یہاں زکوٰۃ دینے نہیں آتے۔" وہ ماہر دکاندار کی طرح بولی۔

لقمان نے سگریٹ مسلتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"پانی ملے گا۔؟"

"کیوں نہیں؟ آیئے۔"

وہ اسے پریشان دیکھ کر اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

"شمشاد اٹھ ...." وہ ایک لڑکی کی طرف منہ کر کے بولی جو اندر کمرے میں پلنگ پر دراز تھی۔

اور پھر گھڑے سے پانی انڈھیلنے لگی۔

لقمان نے پلنگ پر لیٹی لڑکی کو حیرت سے دیکھا اور پھر اس بچے کو جو اس کے پہلو میں پڑا اس کے گریباں سے نکلی چھاتی چوس رہا تھا۔

لقمان کی آنکھوں میں دھند بھر آئی اور وہ منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ کمرے کی دیواریں اپنے ماتھے پر کیلنڈر سجائے کھڑی تھیں اور یہ کیلنڈر خاموشی کی زبان میں اس کہانی کو بیان کر رہے تھے جو رنگین تصویروں کے جھرمٹ سے جھانک رہی تھی۔

روضہ حضرت علیؑ۔ خانہ کعبہ۔ داتا گنج بخش۔ شاہ لطیف کے مزار پر دھمال ڈالتی رقاصہ پلازہ کی گول بلند بلڈنگ اور اس کے ساتھ ہی ایک ننھے بچے کی شبیہہ جو دودھ کے ڈبے سے کھیل رہا تھا۔

لقمان کے گرد یہ نظارے دھمال ڈالنے لگے۔ اسے اپنا ذہن اناڑی کے ہاتھوں چلی ہوئی مشین کی طرح گھڑگھڑاتا محسوس ہوا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب ادھیڑ عمر دلالہ نے اس سے پانچ کا نوٹ لیا اور کب اس لڑکی نے اسے پلنگ پر بٹھایا۔

دھیرے دھیرے گھومتے منظر اپنے مرکز ثقل پر آٹکے اور پُرسکون ہوتے اعصاب اسے صورتحال کا احساس دلانے لگے "میں یہاں کیوں آیا ہوں؟!"

اس نے نیم برہنہ لڑکی اور اس ننھے سے بچہ کو دیکھ کر سوچا اور پھر اپنے ارادوں کا مالک غیروں کو جان کر آہستہ سے کہا۔

"یہ بچہ تمہارا ہے؟" اس کی آواز بالکل ایسے تھی جیسے وہ خود اپنا یا کوئی دوسرا اس کا امتحان لے رہا ہو۔

"جی ہاں!" وہ نخرے سے اس کے کندھے سے لگتی ہوئی بولی۔

"اس کا باپ ہے؟" اس نے نیم باز آنکھوں سے اس کی رانوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہے" — وہ لقمان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "ایک روپیہ تو دو ..... دودھ کے لئے!"

لقمان چونکا اور پھر کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ باہر سے کوئی دروازہ کھول

کر اندر آ گیا۔

شمشاد نے چادر رانوں پر ڈالی اور وہ شرمندگی سے پرے ہٹ گیا۔

اندر آنے والی ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"شمشاد چابی دینا بجھے کی۔ کیسے آ جاتے ہیں ہڈی لینے" نہ وقت دیکھتے ہیں اور نہ بندہ"

ہاتھوں میں کوئی چیز لیے باہر نکل گئی۔

لقمان کو اچانک گڑبڑ کا احساس ہوا کچھ عرصہ قبل کے چھاپے کی خبر اس کے ذہن میں سرخی بجانے لگی۔ رسوائی اور سزا کا خوف اس کے اعصاب کو چھری کی طرح کاٹنے لگا۔ اسے اپنی ساری نیک نامی توے کی کالک میں تبدیل ہوتی نظر آئی۔ ڈر سے اس کے گھٹنے کانپنے لگے اور حلق سوکھ گیا اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے اس نے بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور جونہی ننھے سے جسم نے ہاتھ کا لمس پایا اپنی گول بند آنکھوں سے اسے گھورا وہ سہم کر پرے ہٹ گیا اور اس نپل کو دیکھنے لگا جسے بچے کی ماں اس کے منہ میں ٹھوس آئی تھی اور جو غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

شمشاد نے اسے ڈرتے دیکھا تو بولی ۔" کوئی بات نہیں آتے جاتے رہتے ہیں ۔"

"سپاہی اندر تو نہیں آئے گا۔؟" وہ ہولے سے بولا

"نہیں۔" لڑکی نے اطمینان سے جواب دیا۔

لقمان بڑی مشکل سے اٹھا اور فرش پر ٹانگیں کھول کر کھڑا ہو گیا۔

اسے اپنے آپ پر قابو پانے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔

"سپاہی کا کیا پتہ اندر آ جائے ؟" اس نے تصدیق کرانے کے انداز میں پوچھا۔

"نہیں" ۔۔۔ لڑکی بولی ۔۔۔ وہ تو اپنا حصہ لینے آیا تھا تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔ ادھر آؤ ۔"

لقمان نے اس بچے کو دیکھا جو قدرتی نپل کے بعد پلاسٹک نپل اور اب انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اور پھر ان کیلنڈروں کو گھورنے لگا جن پر ننھی عمارتیں الٹی پر گر رہی تھیں۔

"تم لوگ پولیس کو حصہ کیوں دیتے ہو؟" اچانک وہ بولا۔

"کاروبار جو کرنا ہوتا ہے۔" لڑکی بے زاری سے بولی۔

"تو پھر اپنی یونین کیوں نہیں بنالیتیں ساری عورتیں مل کر۔"

"یونین۔ یہ کیا ہوتی ہے؟" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

"یونین" ؟ لقمان پھر الجھ گیا۔ وہ ساری باتیں جو مختلف سٹڈی سرکلز میں اس نے ٹریڈ یونین کے بارے میں سنی تھیں اب بھولنے لگیں ــــ ایک تکلیف دہ چپ کے بعد وہ بولا۔

"اپنے حقوق کے لئے جد وجہد کرو۔"

یہی ایک فقرہ اس وقت اس کے ذہن میں آیا۔

"تم اگر چاہو تو میں اس سلسلے میں مدد کروں۔"

لڑکی نے اسے غور سے دیکھا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے پلنگ کی طرف لے جانے لگی۔ وہ نڈھال سا جسم لئے پلنگ پر جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ادھیڑ عمر عورت پھر اندر آگئی اور آہستہ سے پوچھا ــ "ہو گئے فارغ ــ وہ مرن جوگا بھی چلا گیا ہے ہڈی خور۔"

لقمان نے تائید میں سر ہلایا اور جلدی سے پوچھا۔

"سپاہی چلا گیا؟"

ادھیڑ عمر عورت نے اثبات میں سر ہلایا ہی تھا کہ وہ چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور ان دونوں کو حیران چھوڑ کر گلی میں غائب ہو گیا

شام کی میٹنگ میں وہ دیر سے پہنچا۔

اس کے ساتھی اس پر تنقید کر رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ لقمان کا جی ان دنوں کام میں نہیں لگتا کوئی اس پر غیر ذمہ داری اور لاپرواہی کا الزام لگا رہا تھا۔ اور تو اور کلثوم کے شہری ایڈیشن نے بھی اس پر سخت اعتراض کئے تھے۔ وہ سر جھکائے تڑختے ذہن اور کھلے اعصاب کے ساتھ ان کی تیز تلخ نوکیلی آوازوں کے پتھر سہتا رہا۔ کسی نے چندے کا ذکر کیا وہ چونکا اور جیب سے رسید

بک نکال کر سامنے رکھ دی اور پھر دوسری جیب سے مڑے تڑے روپوں کی مٹھی باہر نکالی۔ پانچ چار.... نو.... چار.... پانچ نو.... مگر پانچ — اس کی کنپٹیوں میں درد ہونے لگا۔ اس نے بڑی تکلیف کے ساتھ چار روپے رسید بک پر رکھے اور دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ کا نوٹ نکالنا چاہا — اس کا ہاتھ کسی نرم چکنی چیز سے ٹکرایا اور کانوں میں کسی بچے کی قلقاری ٹپکی — اس نے جلدی سے ہاتھ باہر نکال کر نپل کو آنکھوں کے عین سامنے ناک کی سیدھ میں رکھا۔ چند لمحے برف کی طرح ٹھنڈے بے حس لمحے اسے اپنی انگلیوں میں پگھلتے محسوس ہوئے اور پھر وہی کیفیت — ایک خلش اور بوجھل سا غبار دل پر۔ اپنے جسم کی دیواریں توڑ کر آزاد ہونے کی خواہش نسوانی خوشبو پاکر آہٹ پاکر چونک اٹھنا — بے چینی۔ اضطراب اپنی دسترس سے باہر اڑتے جھولے میں بیٹھنے کی آرزو۔ بجلی کی تڑپ، پھر بھی بے بسی، کم مائیگی اور دکھ بھری تنہائی کے دامن میں پھیلا خوف!

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے نپل جیب میں رکھی اور سر جھکا کر تنقید سننے لگا۔

داستاں شبِ رواں کی

پھڑپھڑاتی ہوئی چمگادڑ ٹوٹے روشن دان کی راہ سے باہر نکل گئی تو اس نے اپنی گردن کے زخم کو ٹٹولا جو ان گنت دنوں کی کہانی کا کردار بنے ایک مٹیالے سے نشان کو اگل رہا تھا۔ اس نے پہلو بدل کر اس کرن کو نگاہوں کی ہتھیلی میں دبوچنا چاہا جو افق کے بنیرے سے جھانکتا خورشید اس تک پہنچا رہا تھا۔ مگر یہ کوشش آنکھ کا آنسو بن کر بہہ گئی۔ دن کے رنگین صفحے پر کرداروں نے اپنی کہانیاں دہرانی شروع کیں تو وہ بھی کسی ادھوری سطر کا نقطہ بن گیا۔ سر پر گرے کالی کہ نوں کے جال نے روز کی طرح اس دن بھی انہیں بہلانا چاہا۔ مگر کوئی ان دیکھا ہاتھ ذہن کی کھیتی میں شک کا بیج ڈال گیا —— اس نے دیکھا کہ چوراہے پر نئے ابوالہول کا بت نصب کیا جا رہا ہے۔ چند لوگوں کی زبان پر نئے ابوالہول کا قصیدہ تھا اور چند لوگ وہ بھی تھے جن کی گردنوں پہ لہو پلانے کے سبب کھرنڈ جم گیا۔ اس نے نئی بات کی تلاش میں سارے شہر کا چکر لگایا۔ چوراہوں۔ موڑوں اور پبلک مقامات پر نئے ابوالہول کا بت اس بات کا احساس دلاتا رہا کہ کہانی وہی ہے۔ کردار بدل گئے ہیں۔ اس نے ایک جانے پہچانے چوراہے پر ایک ستون کے ساتھ لاش لٹکی دیکھی جسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی یہ اس شخص کی مانند تھا جس کی تصویر اس کے گھر کی دیوار پر ٹنگ رہی تھی۔ جس میں وہ ساحل پہ کھڑا مچھیروں سے ہمکلام تھا۔ لیکن اب وہ اس چوراہے پر نظر آ رہا تھا۔ پوچھنے پہ پتہ چلا کہ اس نے پرانے ابوالہول کے خلاف لوگوں کے دلوں میں شکوک ڈالے اس کے بت کو توڑا اور اب اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ سزا جس نے اسے امر بنا دیا ہے مگر اس کا صلہ اسے کیا ملا۔ چوراہے پر تو ایک نئے ابوالہول کا قبضہ تھا۔

"توکیا ہوا. کوئی اور سقراط پیدا ہو جائے گا. کسی نے اس کی پوشیدہ بات کا جواب دیا. اس نے گھوم کر دیکھنا چاہا. سامنے ابوالہول کے حواریوں کے قریب جو کہ بت کے گلے میں بن خوشبو کے پھولوں کے ہار ڈال رہے تھے. ان کے قریب ایک شخص کھڑا تھا۔

"ایسا ہوتا رہا ہے کیونکہ یہ آگے بڑھنے کو تحریک دیتا ہے اور پھر اصل بات تو مقصد کی زندگی ہے جو قربانی سے جنم لیتی ہے۔

ابوالہول کے حواریوں نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ پرے ہٹ گیا. اس نے سوچا مجھے اس شخص کے قریب جانا چاہیئے. اس کی باتیں سننی چاہئیں وہ اس کے قریب گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر ایک نیلا سا تل ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

"ایک گیا ہے تو دوسرا آ گیا ہے جو اس سے بھی بدتر ہے اور پھر تیسرا آئے گا پھر ایک دن وہ بھی آئے گا جس کے پاس ہمارے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کا مرہم ہے۔"

"آہستہ بولو۔ یہاں قدم قدم پر سفید کپڑے والوں کی پرچھائیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کسی اور نے مدہم سی آواز میں اپنے خوف کا اظہار کیا. لوگوں نے اس کی باتوں کو اپنے دامن میں باندھ لیا۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ ابوالہول کے بت کی جانب پیش قدمی کرتے. سب نے چوراہے میں مصلوب سچائی کو اپنی نگاہوں کی نرم حدت سے محبت بخشی. بے چارے نے اپنے آپ کو دوسروں پر قربان کر دیا۔ مگر ابوالہول کے حواریوں نے بات پوری نہ کرنے دی اور انہیں منتشر کر دیا. اور لوگ اپنے ہاتھوں میں کنکریوں کو بھینچے پناہ گاہوں کو دوڑے اور جب وہ پناہگاہ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا تو اس نے چھتوں اور کواڑوں کی اوٹ سے جھانکتی عورتوں کو دیکھا جن کی آنکھوں میں انتظار کے کانٹے اُگے ہوئے تھے جن کی پلکیں لرز لرز کر کہہ رہی تھیں کہ کب نیا سورج طلوع ہو کر ان کے چہروں کو روشن کرے گا۔ اور پھر کئی دن خاموشی کی ہیبت گپھا میں دفن ہو گئے۔ ان کے کندھوں پر اُگے پتے روز بروز زرد ہوتے چلے گئے. کیونکہ خون کی کاریزیں جو بدن کی کھائیوں سے گزرتی تھیں راستے میں لہو پینے والے کے ہاتھوں لٹ جاتیں۔

ایک دن جب کہ سرگوشیوں کا بادل تشکک کی کھائی کو تر بتر کرنے لگا تو وہ اس میدان کو چلا

آیا۔ جہاں اس کی مانند دوسرے ہزاروں ایک آواز کی پکار پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس نے ہجوم میں کسی آشنا کو ڈھونڈنا چاہا۔ مگر سب پیشانیوں پر ایک ہی نام لکھا ہوا تھا۔ اپنے احساس کی تمام قوتوں کو یک جا کر کے اس نے نیلے تل والے کو ڈھونڈ لیا۔ میدان میں انہوں نے ابوالہول کے سر پر لہو پینے والی چمگادڑ کو پر پھیلائے دیکھا۔ ابوالہول کے حواریوں نے ان پر آگ کی گرلیاں برسائیں اور وہ اپنے دفاع کی خاطر اپنے گھونسلوں کو بھاگے۔ ان پرندوں کی مانند جن کے تعاقب میں خونی شکرے لپک رہے ہوں۔ اس نے نیلے تل والے کے قدم پر قدم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور جب وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچے جہاں انہیں لہو پینے والی چمگادڑ کا خوف نہ رہا تو اس نے اپنی گردن کا نشان دکھا کر ان میں مستقل شمولیت اختیار کر لی۔ نیلے تل والے کو اپنے ارد گرد بیٹھے بے شمار لوگوں سے باتیں کرتے دیکھ کر اس کا جی بھی کچھ کہنے کو مچلا، وہ کب آئے گا؟

"وہ آسمان سے نہیں اترے گا۔ وہ ہم میں سے ہو گا۔ تم میں سے نیلے تل والے کی پیشانی اسے دانائی کے عرق میں بھیگتی نظر آئی۔ اس کا جی چاہا کہ اور بھی کچھ پوچھے۔ مگر ایک دلدوز آواز نے ان سب کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر اب زندگی کا ایک لمحہ بھی حرام ہے۔ وہ سب بولنے والے کی طرف دیکھنے لگے جو ایک سمت کو تیزی سے بھاگ رہا تھا

"تم نے اسے جانے کیوں دیا" کسی نے نیلے تل والے کو مخاطب کیا۔

"یہ ابھی نہیں مرے گا۔ یہ لمحاتی ابھار ہے۔ دب جائے گا ابھی اس نے بہت کچھ کرنا ہے اور یہ "بہت کچھ" اسے مرنے نہیں دے گا۔ اور پھر یہ اس کی دوسری تیسری یا چوتھی موت ہو گی۔

"کیوں یہ کیسے؟ کئی آوازیں ایک سوال بن کر ابھریں۔

" اس لئے کہ یہاں ہم پیدا ہوتے ہی مرنا شروع نہیں کر دیتے بلکہ پیدائش سے لے کر موت تک کئی بار مرتے ہیں۔ ایک غیر طبعی موت جو طبعی موت سے زیادہ بھیانک اور اندوہناک ہے۔" مگر اب کیا ہو گا؟

"کچھ بھی نہیں وہ ابھی لوٹ آئے گا"

اور جو مرنے گیا تھا خودکشی کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ سامنے ریل کی پٹڑی نے اسے اپنی جانب بلایا۔ اس نے چپ چاپ اس بلاوے کی تعمیل کی اور خود کو پٹڑی پہ دراز کر دیا اور اس لمحے روشنی کی گرل پتلیاں میچے اندر ہی اندر ڈوبنی شروع ہوگئیں۔

دور کہیں آوازوں نے ہوا کے کواڑوں پہ دستک دے کر کسی کی آمد کا مژدہ سنایا اور پھر آوازوں کے بطن سے ایک بدوضع سا انجن ابھرا جس کے عقب میں ڈبوں کی طویل قطار تھی۔ خودکشی کرنے والے نے ان آوازوں کی تصویر اپنے ذہن کی دیوار پہ لٹکی دیکھی اور پھر کئی آشنا چہرے بلگجے اندھیرے میں ابھرے اور کہنے لگے "تم بہت بزدل نکلے۔ اتنی جلدی اکتا گئے۔ ہم نے تو ایک ساتھ سفر کرنا شروع کیا ہے۔ کالی چٹانوں میں پوشیدہ خزانوں کی تلاش میں تم نے ابھی ہمارا ساتھ دینا ہے اور پھر یہ عمل؟ یہ بزدلی ہے، منافقت ہے۔ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تم ——؟

اسے اپنے اندر ایک کوندا سا لپکتا ہوا محسوس ہوا۔ بے اختیار ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور آوازوں کے سمندر میں قطرہ بن کر گم ہوگئی۔ اس نے ایک جست لگائی اور سر پہ پہنچی ہوئی گاڑی کے سامنے سے بھاگ اٹھا۔ اس نے دوڑتے دوڑتے عقب میں مڑ کر دیکھا۔ ریل گزر چکی تھی اور پٹڑی پہ کوئی لہولہان تڑپ رہا تھا۔ وہ دگنی رفتار سے بھاگنے لگا اور جب وہ وہاں پہنچا جہاں سے چلا تھا۔ تو وہ نیلے تل والا کہہ رہا تھا وہ ابھی آجائے گا"

"لو وہ آ بھی گیا۔ سب نے اسے اپنی نگاہوں میں بھینچ لیا۔ اس کے گرد کھڑے لوگ پٹڑی پر مرنے والی ہستی کی ادھوری موت اور ادھوری زندگی پر ہنسنے لگے۔ بے تحاشا ہنسی ان کے ہونٹوں سے یوں نکل رہی تھی جیسے زخمی کے لبوں سے سسکیاں اور پھر اچانک ان کی مسکراہٹوں پہ کانٹے اگ آئے۔ ان کے قہقہے کراہیں بن کر سوکھے دہانوں سے چھلکنے لگے اور وہ سب ایک ہی آواز میں ماتم کرنے لگے۔

کئی دن تک ان کی پلکیں گیلی پڑی رہیں کوئی ان کی نمی خشک کرنے نہ آیا اور ان کے

سروں پر اگی کالی گھاس دن بدن گھنی ہوتی رہی۔ بشارت دینے والے فرشتے جب زمین کے قریب آتے تو ابوالہول کے حواری انہیں اپنی جنت میں گھسنے والے شیطان جان کر ان پر جلتے تیز برساتے اور یوں لہو پلانے والی مخلوق آسمانی باپ کی مدد حاصل نہ کرسکتی اور ایک دن وہ سب اپنے مشترکہ خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کی خاطر گرد میں اٹے راستوں پہ نکل آئے۔

وہی جگہ تھی، وہی آسمان، نیلے تل والے نے ان سے ایک نو وارد کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ بھی اپنے قبیلے کا آدمی ہے"۔

"مگر اسے ٹھونک بجا کر تو دیکھ لو۔ کسی نے اپنے وہم کا اظہار کیا: "تم چاہو تو اپنا یقین کر سکتے ہو۔ میں تو ایمان لا چکا ہوں"۔

نو وارد نے اپنا سینہ ننگا کر کے ان کو دکھا دیا جو کورے لٹھے کی طرح صاف تھا۔

"مگر تمہارا وطن؟" اس نے پوچھا۔

"میرے کئی وطن ہیں۔ جلی ہوئی زمین اور جہاں جہاں انسانوں کو بیدخل کیا گیا ہے۔ میرے وطن ہیں۔

"مگر تم یہاں کیوں آئے"۔

"تمہیں یہ بتانے کہ اب انتظار کا وقت نہیں رہا۔ تمہیں خود ہی اپنا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ اگر چاہو تو اپنے سر نیزوں پر پرو کر اپنے بعد میں آنے والوں کی خاطر آبِ فرات حاصل کر سکتے ہو"۔

مگر یہاں تو بہت سارا خون بہے گا۔ نیلے تل والے نے سرد لہجے میں کہا۔

"خون جو پانی کی مانند اذہان میں انقلاب کی پنیری کو سیراب کرتا ہے اور جس پنیری سے وہ نسل جنم لے گی جس کا خواب صدیوں سے انسان دیکھ رہا ہے"۔

"مگر کب؟ ہم اب انتظار نہیں کر سکتے۔ ہم تو مدتوں سے سڑ گل کر رہے ہیں اور اب تم واپس جاؤ تو اپنے ساتھیوں کو ہمارا سلام کہنا"۔ وہ سب نو وارد کی باتوں سے بہت محظوظ ہوئے اور

اسے بھی یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ابوالہول کا وجود موجود ہے۔ وہاں چمگادڑوں کے پر جھڑنے شروع ہو چکے ہیں۔ اس نے مٹھی میں جکڑی کنکریوں کو گہرے اعتماد سے دیکھا اور چوراہے کی سمت ہو گیا جہاں ایک اور شخص کو فصیل پہ سے گرایا جانا تھا اور جب گرائے جانے والے کو سامنے لایا گیا تو سب لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بھی ان کا ایک ساتھی تھا نئے راستوں کا جہاں گرد، نئے سورج کا متلاشی اور ابوالہول کا دشمن۔ نووارد نے یہ سماں دیکھا تو بولا: میرے سارے ہموطنوں میں بھی ہم لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے مگر ہم ایک بار مرتے ہیں تو دوبارہ جی اٹھتے ہیں۔

"آہستہ بولو یہاں قدم قدم پر بھاری نعل زدہ بوٹوں کی دھمک تمہاری سماعت کے آبگینوں کو توڑنے کی منتظر ہے۔"

مگر اب رکا نہیں جاتا۔ ان چنگاریوں کو اور بھڑکانا ہوگا۔ مشرق۔ مغرب۔ شمال۔ جنوب چاروں اور آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اس میں کود جاؤ کندن بن جاؤ گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری سستی تمہارے لئے سورج کی کالی پشت لے آئے اور تب لوگوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور ابوالہول کے حواریوں پر پل پڑے۔ فضا میں بدر و حنین کی دھول اڑنے لگی لوگوں نے تمام کنکریاں ابوالہول کے بت پر برسا دیں اور اس کے نتیجے میں ابوالہول کا بت جا بجا سے ٹوٹ گیا، اس کے حواریوں کے حوصلے جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ اور بالآخر تلوار والوں نے میدان مار ہی لیا۔ لوگوں نے افق کے بنیرے سے ان بے شمار کرنوں کو ٹوٹ کر گرتے دیکھا جو اس سے پہلے انہیں تیروں کی طرح چبھتی رہی تھیں۔ لیکن ان کرنوں کی اوٹ سے جو سورج نکلا وہ پہلے سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ان کے سروں پر اگی کائی گو کہ کٹ چکی تھی۔ مگر اس کی جڑیں نہ اکھڑیں اور اب چوراہوں میں ایک تیسرا بت نصب تھا۔

"اور اب تیرا نمبر آگیا ہے مگر ہم خود کو اب بھی بے ستون گھروں میں مقید پاتے ہیں۔ وہ اپنے من میں سوچتا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ ننھے تل والے کو قرار ہے۔ لہو پینے والی چمگادڑ کے پر جھڑ چکے تھے۔ مگر نئے پر بھی نکل سکتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری پہچان

ایک بار پھر ہمیں فریب دے گئی ہو۔ وہ مضطرب و بے قرار تھا۔ مگر پُر امید کیونکہ تمام لوگوں نے پھر اپنی مٹھیوں میں کنکریاں تھام رکھی تھیں۔ وہ ان سفید کپڑوں والوں کی شناخت بھی کرتے ہیں جو انہیں اس بات کا احساس دلاتے کہ ان پر اعتماد نہیں ہے۔ اب وہ اپنے جذبوں کو سب کے سامنے برملا بیان کرتے اور ابوالہول کے تیسرے بت کی ذرا ذرا سی بات پر غور کرتے اور اسے یہ سب کچھ دیکھ کر احساس ہوا کہ پھل بہت جلد پک جائے گا۔"

کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ اور میں بھی رات کی آغوش میں سمٹ کر اسے کئی بار دہراتا ہوں اور پھر ایک کردار بن کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

عذابُ النہار

آوازوں کی البم بوجھل ہوتی جارہی ہے۔

انسانی، غیرانسانی آوازیں رات کے اس پہر جب ریاضت کے چراغ جلاکر ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، باہر میدان میں کتے بھونکتے ہیں اور کمرے کی کھڑکی کے پردوں سے رگڑ کھاکر فیکٹری کے دامن سے اڑتی آوازوں کی کترنیں چاروں طرف بکھر جاتی ہیں۔ رات کے وقت آرامشین چلنے لگتی ہے۔ لکڑی "گے لی" کی جگہ مجھے لٹا دیا جاتا ہے اور آرے کے نوکیلے دندے بھیانک چنگھاڑ کے ساتھ میری رانوں کے جوڑ کو چیرنے لگتے ہیں — انسانی اور غیرانسانی آوازیں، دن اور رات کی تمیز ختم ہوگئی ہے۔ آوازوں کی البم بوجھل ہوتی جارہی ہے۔

"مجھے خاموشی چاہیئے۔۔۔۔ مرنے کے لئے۔۔۔۔۔ یہ شور رُوح کے نکلنے میں اذیت کا باعث بن رہا ہے۔"

کتوں کا شکر میدان میں چکر لگاتا ہے چوروں کی بُو سونگھنے کے لئے پر چور کہیں نہیں کہ چیزیں نایاب ہوگئی ہیں۔ میدان کے کونے میں جوہڑ کے مینڈک اجتماعی آہنگ کے بادبان پھیلائے آوازوں کے ہجوم میں شریک ہوچکے ہیں — فیکٹری کے باہر سڑک پہ کھڑے ٹرک سے ڈرم پھینکے جارہے ہیں۔ ٹرک برائے مرمت بند ہے" کے بورڈ کے ساتھ لال رنگا کپڑا ٹانگ کر لالٹین لٹکا دی گئی ہے۔ ساری رات سڑک کے سینے کو بھاری انجن اپنے گول پہیوں سے رگڑتا ہے۔ بجری چرچراتی ہے۔ گرم تارکول کے ٹب تلے جلتی لکڑیوں کا الاؤ بڑک مار کر شعلے

اچھالتا ہے اور سڑک مرمت کرنے والے مزدور نعرہ مار کر بجری کی ٹوکریاں پھینکتے ہیں آوازوں کی ریتھ دندناتی چاروں طرف پھیلی رات کے سینے میں بھونچال بپا کرتی ہے۔۔۔۔

رات کے اس پہر جب ریاضت کے دیئے جلا کر ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔۔۔۔ تو کوئی ہتھوڑی سے لکڑی کے تختوں میں کیل ٹھونکتا ہے۔۔۔۔ ٹخ۔۔۔۔ ٹخ ٹخ۔۔۔ ٹک ٹک۔۔۔۔ ٹخ۔

"صرف اسی پر اکتفا کرو۔۔۔۔ آوازوں کو اتنا مت پھیلنے دو کہ اپنی آواز گریہ بن جائے"۔

"حضرات"— مسجد کے مینار سے بندھا سپیکر چلاتا ہے۔" ایک بچی جو بول نہیں سکتی، گم ہوگئی ہے اس کے والدین سخت پریشان ہیں جس کسی کو بھی ملے دار الامان پہنچا دیں"۔

"نن — نہیں — نہیں — یہاں جگہ تنگ ہے — تعداد زیادہ — ہمیں ابھی تک والدین لینے نہیں آئے —"

"خاموش رہو"

"ہمیں کبھی خامشی میں ایک دوسرے کی آواز سننے کا موقع ملے گا — اور تو اور — یہ مکھی — اُف خدایا —"

"جب میں اپنے لبوں کو تیرے رُخسار کی جانب بڑھاتا ہوں اس کی مکروہ بھنبھناہٹ سے میری آنکھوں میں جلن ہونے لگتی ہے — پانی بھر آتا ہے —

"پہلے اس سے چھٹکارا حاصل کرو"

وہ جلدی سے اُٹھ کر کونے میں پڑی بندوق اٹھاتا ہے۔ کارتوس نال میں ڈال کر نشانہ لیتا ہے کہ مکھی گلدستے سے اڑ کر اس کی ناک پہ آبیٹھتی ہے۔ وہ بندوق کا رُخ اپنے چہرے کی طرف کر کے لبلبی دبانا چاہتا ہے۔

"ناں۔۔۔ نا۔۔۔۔ خدا کے لئے۔۔"

وہ چیخ کر اس کی طرف لپکتی ہے اور مکھی اڑ کر کہیں اور جا بیٹھتی ہے لیکن اس کی بھنبھناہٹ ریت کے ذروں کی طرح گرے ہیں، اس کے کانوں میں، مساموں کے اندر دھنس جاتی ہے۔

باہر سڑک پر ڈرم پیٹے جا رہے ہیں آرا مشین کا شور، کتوں کی بھونکار اور مینڈکوں کی ٹراہٹ گلی میں گشت کرتی کمرے کی کھڑکی سے ہوتی اس کے ہاتھ میں پکڑی بندوق کی نوک پہ آ بیٹھی ہے۔

"حا — حا — حا — ذرات — ایک لڑکا جو چلنے سے معذور ہے، گھر سے غائب ہو گیا ہے .... جس کسی کو"

"اُف خداوندا اتنا شور — کیا تو خود آواز تو نہیں بن گیا ہے کہ اپنے بندوں کو اذیت دینے کا اس سے موثر طریقہ تیرے ہاتھ نہیں آیا — ؟؟

"ہم جب بھی ایک دوسرے کے لبوں پہ — دنیا ہماری خوشی پہ شب خون مارتی ہے"

"ٹک — ٹخ — ٹک — کوئی لکڑی کے تختے میں کیل ٹھونک رہا ہے یا دیوار میں نقب لگا رہا ہے — ؟؟"

"وہ ہمیں پکڑنے آ رہے ہیں"

"میرے ہاتھ میں بندوق ہے"

"ان کے ساتھ آوازیں"

"لیکن — میں —"

"تم مکھی — مکھی نہیں مار سکتے"

وہ جھنجلا کر بلب کا نشانہ لیتا ہے۔ لبلبی دبانا چاہتا ہے کہ مکھی بلب سے اڑ کر اس کے گال پہ آ بیٹھتی ہے۔ وہ چیخ مار کر اسے چہرے سے اڑاتی ہے۔ سارے چہرے پہ بھنبھناہٹ کا شیرہ چپک گیا ہے وہ ایک ایک تار کر کے اتارتی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آواز کے کانٹوں سے پناہ مانگتی ہے۔

"حضرات .... اعلان ایک مرتبہ پھر سنیئے — حا — حا — ضورات — ایک بچہ جو چلنے سے معذور ہے گھر سے غائب ہو گیا ہے — جس — حا — ز — ر"

"ن — نہیں میں خود چل کر آیا ہوں — میں معذور نہیں — میں خود —"

"یہاں ہم پہلے کیا کم تھے ؟"

"کیا مطلب"

"ہمیں ابھی تک والدین لینے نہیں آئے۔ تم کیوں آگئے؟؟"

تم — ہیں — میں تمہیں ملنے نہیں آیا — میں تو اس کے گالوں پہ اپنے ہونٹوں کا نقش اتارنے آیا ہوں"

"چپ کر — بے شرم —"

آوازوں کا لشکر اسے لہو لہان کئے، اپنے نرغے میں لئے۔ ٹرک کوٹتے انجن کے گول بھاری پہیوں تلے لٹا دیتا ہے۔ ٹرک سے ڈرم بے ترتیب آوازوں کی جھاگ چھوڑتے اس کے پہلوؤں میں گرتے رہے اور آرائشین کے دندے ماس چیرتے گوشت کی دھجیاں اڑاتے میدان کے۔ جوہڑ کے مینڈکوں کی بھیانک جھنکار کے جلو میں اس کی پسلیوں کی طرف بڑھتے رہے۔ وہ گول بھاری پہیئے تلے پستا، آرائشین تلے لیٹا، شرابے کی قبر میں پہلو بدلے بغیر آنکھیں موڑ کر ٹرک کو تکتا ہے۔ ایک شخص نے کفن پہن رکھا ہے ڈرم کو پتھر سے بجاتا ٹرک برائے مرمت بند ہے کے بورڈ سے لٹکی لالٹین اٹھا کر بستی کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کی آنکھ لپک کر کفن پوش کے تعاقب میں پھیلتی ہے جو ہر دروازے پہ جا کر ڈرم بجاتے ہوئے پوچھتا ہے۔

"آپ کا کوئی عزیز تو گم نہیں ہوا؟؟"

مکین دروازے سے جھانک کر، کھڑکیوں سے چمٹ کر روشن دانوں سے لپک کر اس کی بات سنتے ہیں اور جھٹ سے اندر جاتے ہیں۔ کمروں میں کارنس پر رکھی چیزیں گنتے ہیں بکسے کھول کر ٹٹولتے ہیں، اپنے گوداموں سے نیفے تک ہر شے کھنگا لتے ہیں اور پھر جلدی سے پہلی جگہوں پر آ کر کہتے ہیں۔

"نہیں — پورے ہیں — بالکل پورے"

کفن پوش ڈرم کوٹتا آگے بڑھ جاتا ہے اور اگلے دروازے پہ۔

"اتنا شور — اتنا شور تو تخلیقِ کائنات کے وقت بھی نہیں مچا تھا"

"تم اس وقت موجود تھے؟"

"ہاں — میرے شور سے ہی تو یہ سب کچھ ہوا تھا۔ مگر —"

"تو پھر بھگتو"

"مگر اتنی آوازیں"

"تم ایک بار انہیں چپ رہنے کو تو کہو — شاید —"

وہ کھڑکی کی طرف منہ کرکے ہاتھ باندھتا ہے۔ آوازوں کے بپھرے گھوڑے ہنہنا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوجاتے ہیں وہ انہیں چپ رہنے کی تاکید کرتا کہ مکھی — کسی نامعلوم — تاریک کونے — دور دراز کے منطقے سے پرواز کرکے اس کے کان پر آ بیٹھتی ہے۔ آرا مشین کے تختے پر پڑے شخص کا جسم بھنبھناہٹ سے بھر گیا ہے۔ آرے کے نوکیلے دندے اپنی نوک پہ مکھی کا ڈنک لگائے اس کے جسم میں نقب لگاتے ہیں

آرے کے نوکیلے دندے میری پسلیوں کو چیرتے دھیرے دھیرے اوپر چڑھ رہے ہیں مکھی کی بھنبھناہٹ برادے پہ پھیلے لہو میں شامل ہو کر ساری فضا کو ڈھانپ لیتی ہے۔

"مجھے خاموشی سے مرنے دیجیے — یہ آوازیں"

لالٹین گلے میں لٹکائے پتھر سے ڈرم بجاتا وہ میرے سرہانے آکھڑا ہوتا ہے۔ اور کان کے پاس زور سے کرخت آواز نکال کر پوچھتا ہے۔

"آپ کا کوئی عزیز —؟"

"ہاں — میں خود — میں خود گم ہو گیا ہوں"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستا ہے، اور ایک طوفانی ردم میں پتھر ڈرم پہ مارتے ہوئے مسلسل قہقہے لگاتا چلا جاتا ہے۔ آوازوں کی آندھی میں ایک اور بگولے کا اضافہ ہو گیا ہے مینڈک اور کتے گریہ کرتے ہیں اور آرا مشین اپنی بھیانک آواز کے ساتھ انہیں تھپکی دیتا ہے تب ان کے درمیان آوازوں کا ٹوٹا ہوا پل بن جاتا ہے۔ وہ ہاتھ میں پکڑی بندوق کو ایک طرف جھکا کر دوسرے ہاتھ سے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے — وہ لپک کر اس کے پہلو میں آبیٹھتی ہے۔ وہ لب بڑھا کر اس کے گالوں پر اپنے ہونے کی بشارت دینا چاہتا ہے۔ کہ

مکھی باہر پھیلی آوازوں کو اپنی پشت پر رکھے ان کے درمیان آ جاتی ہے۔ وہ غصے میں ایک طرف جھکی بندوق سیدھی کرتا ہے اور مکھی کا نشانہ لیتا ہے مکھی سارے کمرے میں اڑتی بارود سے بچتی بلب کی روشن گولائی پہ جا بیٹھتی ہے۔

وہ پل بھر کا توقف کئے بغیر لبلبی دباتا ہے۔ دھماکے کے ساتھ کمرے میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ وہ جوابی حملے سے بچنے کے لئے فوراً دوسرا کارتوس بھرتا ہے۔

"حا — حا — حا زراط — حضرت — ایک لڑکا جو چل نہیں سکتا اور ایک لڑکی جو بول نہیں سکتی، جس — کسی — سی . . . ." آواز ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتی ہے۔

کمرے میں چھائے اندھیرے کے ساتھ ہی میدان میں دوڑتے کتوں کے قدم زمین میں گڑ گئے ہیں۔ جوہڑ کا پانی مینڈک کی آنکھوں میں سوکھ گیا ہے۔ "ڈرمز" کے گرنے کی آواز کی جگہ سناٹا ہے اور مشین کا آرا ایک خاموش جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا ہے۔ کفن پوش شخص جلدی سے ایک خالی قبر میں گھس گیا ہے، اور وہ۔ جو آرا مشین تلے لکڑی کی "گیلی" کی جگہ پڑا تھا اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ابھی لوہے کے تیز دندوں نے اس کے دل کو نہیں چیرا تھا۔ بانہیں کھول کر ہاتھ پھیلا کر فاصلے کو تسخیر کرتا ہے اور ان کے سروں پر پھیلے اندھیروں میں نقب لگا کر ان کے لئے ریاضت کے چراغ جلاتا ہے مگر اس لمحے جب انہیں سکون کا اولین احساس ہوا تھا، سورج کھڑکی کے باہر کہنیوں کے بل اوپر اٹھ کر اپنی پہلی کرن ان پر پھینکتا ہے۔

وہ اس کے گالوں پہ اپنے لبوں کا نقش اتارنے کے لئے چہرہ آگے کرتا ہے کہ کرن ان کی راہ میں حائل فصیل بن جاتی ہے۔

وہ سامنے، غیظ کے عالم، افق سے طلوع ہوتے سورج کے چہرے پہ بھنبھناتی مکھی کو دیکھ کر نشانہ باندھتا ہے۔

انگلی لبلبی پر کانپ رہی ہے اور وہ منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اسے بتائے کہ آج سورج کی جگہ اس کا طلوع تھا۔

باہر سناٹا آواز کا منتظر ہے۔

جنّت بدر

"میں چھپ کر دیکھوں گا ـــــ اور تم عشق کرو" ـــــ

اس نے میرا منہ میٹھے سے بھر دیا اور کپڑوں پہ عطر چھڑک کر خود ستون کی اوٹ میں چلا گیا۔ جس طرح تھوڑی دیر قبل چاند دیوار کی آڑ میں جاکر ہماری خاطر تاریکی پھیلا گیا تھا۔ اس محفوظ تاریکی میں سبز گھاس پہ ہمارے جسم موسم سے بے نیاز اپنی اپنی نیاز بانٹنے کو تیار تھے۔

ہم محفوظ اندھیرے میں بیٹھے جوان جسموں والی مخلوق تھے، ست برگے کے پھولوں کی باس میں گم۔ ان حیران آنکھوں کی آرزو سے بے خبر تھے جو ستون کی پرلی طرف ہمیں دیکھ رہی تھیں وہ چور آنکھیں جو لوگوں کو عشق کرتے دیکھتی ہیں؟ ہمارے سروں پہ سایہ کئے ہوئے تھیں۔ کبھی کبھار ہم اونچی آواز میں بولنے لگتے تو میں اس کی پریشانی کا احساس کرکے اداس ہو جاتا ـــــ وہ بوڑھا شخص، جس کا بچپن یتیم خانوں کے دریچوں اور مسجد کے حجروں سے ہوتا ہوا رہن رکھی جوانی کے آنگن میں جھلس گیا تھا۔ اپنی بھوک کا کشکول لئے راتوں کو گلیوں میں گھوما کرتا تھا ـــــ بند دروازوں کے اندر چرچراتی مسہریوں، بولتی شکنوں اور اقرار و انکار کے لمحوں میں گھلتے جسموں کو اپنے شفیق سائے کا تحفظ دیتا ـــــ

چوکیدار کی آہٹ سن کر وہ کتے کی طرح دوہرا ہو جاتا اور کتے کی بھونک پہ وہ بلی بن کر پرنالے پہ چڑھ جاتا۔ اور یوں ایک طویل عرصہ تک وہ گشت کرنے والے بے رحم لوگوں سے محفوظ رہا ـــــ مگر کب تک ـــــ؟ ایک دن یا ایک رات کہ دن اور رات اس کے لئے جسموں کے انمول ملاپ کی آندھی میں ڈھل چکے تھے ـــــ وہ پکڑا گیا ـــــ تب گشت کرنے والوں نے اس کے نورانی چہرے

پہ کالک مل دی یہ دیکھے اور جانے بغیر کہ اس کے رنیق سائے کی پناہ میں لوگ بدن کا ذطیفہ کرتے ہیں اور اب وہ رسوائی کی پوشاک اوڑھے شہروں سے دور قدیم محلوں کے کھنڈرات، باغوں کے گنجان کنجوں اور پہاڑوں کی کھوہ میں لوگوں کو مٹھائی، کھلونے، عطر، تعویز اور دعائیں دیتا ہے اور کہتا ہے ــــ

"تم عشق کرو ــــ اور میں تمہیں دیکھوں گا۔"

"کوئی ہمیں دیکھ نہ لے؟" اس نے میرے پہلو میں پڑے پڑے اپنے بالوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے کہا ــــ

"دیکھنے والی آنکھیں رہن رکھی جا چکی ہیں۔"

میں نے اس کا چہرہ بالوں کی بدلی سے نکال کر ہتھیلیوں کی محراب میں سجا لیا۔

"کوئی ہماری باتیں سن نہ لے۔"

"سننے والے کان ــ

میں نے اپنے لبوں سے اس کے کان کی لَو کو حدت بخشی۔

"چھوڑو ــــ ہٹو ــــ تمہیں تو عشق کرنا بھی نہیں آتا۔"

"عشق ــــ کیسے کیا جاتا ہے؟"

میں نے اس کے بدن کو دور ہوتی چاندنی کے روبرو کھڑا کر دیا۔

یوں ــــ اس طرح ــــ"

اس نے اپنے لبوں سے میری زبان کو سہارا دیا ــــ نوکیلی بھیگی زبان جو سانپ کے منہ سے نکل کر میرے تالو میں آ جڑی تھی ــــ سرسرانے لگی ــــ لہرانے لگی ــــ اس کے چمکیلے کٹیلے دانتوں تلے میری زبان نے لذت کے ان گنت پھول کھلتے محسوس کئے۔

"اس طرح ــــ"

سینے کے سنگِ مرمر بے نام سروں کا نغمہ الاپنے لگے ــــ ان کہی داستانوں کو عیاں کرتے ہم دونوں ــــ ستون کی پرلی طرف چور مہربان آنکھوں کی سسکیوں سے بے خبر وقت کو

چٹکیوں میں مسلتے رہے۔

ستارے بہت نیچے آ چکے تھے۔ درختوں کے آلنوں میں پرندے پروں کی گرمائش اوڑھے حیرت کی مہین آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اور جب تھوڑی دیر بعد، میں نے یکسانیت سے اکتا کر پہلو بدلا تو وہ بولی۔

"تمہیں تو پیار کرنا بھی نہیں آتا۔ پتہ ہے عشق کیا ہے۔؟"

"کیا ہے؟ اور کیسے کیا جاتا ہے؟"

"عشق ——— اس نے بازو کھول کر ہوا کا راستہ کاٹا"

"عشق کی دید آدمی کو مار دیتی ہے۔ ہر ایک اس کا متحمل نہیں ہو سکتا ———"

اچھا ———"

"ہاں ———" اس کے پھیلے بازوؤں نے ستاروں کو آغوش میں بھرا اور پھر میرے گلے کا ہار بنا کر اپنے سینے کے چاند کو میرے ہونٹوں کے اُفق پر طلوع کیا۔ تب ہم لپک کر چاند کی زمین پر اتر گئے۔ پرانے کھنڈر، باغوں کی روشوں، محل کی ٹوٹی محرابیں اور ستون کی اوٹ میں روتا بوڑھا، ہر شے اپنی محرومی کا راگ الاپ رہی تھی۔

"سنا ہے کہ چاند پر چرخا کاتنے والی ایک بڑھیا ہوتی ہے؟"

ہاں ———"

"اس کا بوڑھا کہاں گیا؟

زمین پر آ گرا ہے۔ اس سے جدا ہو گیا ہے"

"اس کا گزر کیسے ہوتا ہے؟"

"بڑھیا کا گزر کیسے ہوتا ہو گا؟"

"ہٹو ——— پرے ہٹو ——— تمہیں تو پیار کرنا نہیں ——— آتا

"پیار کرنا تو بڑھیا کو بھی نہیں آتا تھا ———"

میں تمہیں سکھاؤں ———"

تب ہم دونوں ـــــ پھر

اچانک ہمارے قریب، ستون کی اوٹ میں کسی نے ہچکی بھری اور خاموشی مزید گہری ہو گئی ـــــ

"کون ہو سکتا ہے؟" اس نے ہولے سے کہا۔

ہم دونوں لپک کر ادھر گئے۔

ہماری نظروں کے سامنے ستون سے ٹیک لگائے چاند کا بوڑھا رخصت ہو رہا تھا۔

"یہ ـــــ یہ ـــــ یہ تو مر رہا ہے۔" میرے لبوں سے نکلا۔

"یہ ہمیں دیکھتا رہا ہے۔ وہ بولی۔ یہ تاب نہیں لا سکا۔ ناں ـــــ اس لئے ـــــ یہ ـــــ یہ مر گیا ہے ـــــ عشق کی دید آدمی کو مار دیتی ہے ـــــ مگر آؤ چھوڑو ـــــ تمہیں عشق کرنا سکھاؤں۔ تمہیں تو ہر چیز سکھانی پڑتی ہے۔"

پارکوں کے تاریک کونوں، اجڑے ہوئے باغوں، محلوں کے کھنڈروں کے اندر، قدیم شہر کی بوسیدہ گلیوں میں ـــــ جہاں کہیں ہمیں کوئی تنہا بوڑھا ملتا ہے۔ ہم اس کی ہر ضرورت پوری کرتے ہیں منت کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"ہم عشق کریں گے ـــــ اور تم ہمیں دیکھتے رہنا ـــــ"

دراصل ہم اپنی جنت سے نکال دیئے گئے ہیں۔

کٹی ہوئی لکڑیاں

سورج کی راہ میں گلیشیئر آ گیا تھا ۔

دھوپ ، دھندلائی سی فضا میں رستہ بناتی ، زمین پہ آتے آتے تھک گئی ہے ۔

ہجوم خالی ہاتھ ، بھری آنکھیں لئے واپس ہوئے ۔

تماشہ ختم ہونے کو تھا ۔

چھتوں ، بازاروں ، چوراہے کے ہجوم ــــ لوگ جا رہے تھے ۔

فلش گنوں کی چکاچوند کے بعد انجینئر کے ٹیلی پرنٹرز کھڑک رہے ہیں ۔

"خبر بنے گی ــــ اخبار بکے گا ۔"

"لیکن ہمارے لئے نہیں کہ ہمارے سامنے ہی تو وہ درخت پہ چڑھا تھا ۔"

"میں تمہارے لئے لکڑیاں کاٹنے جا رہا ہوں ۔"

"اچھا ــــ !!"

"نیچے کھڑے رہنا ــــ یار ــــ بڑی ٹھنڈ ہے ۔"

"اندھیرا ابھی ہے ۔"

سورج کی راہ میں گلیشیئر آ گیا ہے ۔

درانتی دانتوں میں دبائے وہ تنے سے بھڑتا ، اوپر شاخوں کے پاس چلا گیا ۔ سڑک پہ چلتے لوگوں نے اسے دیکھا اور چلتے رہے ۔

نیون سائن جلتے بجھتے رہے ، ہوٹلوں اور دفاتر کے اندر بجلی کے ہیٹر سرخ ہوتے رہے کہ

گیارہ ہزار دو لیٹج اس علاقے کے لئے وقف تھے۔

"گیارہ ہزار دو لیٹج"؟

"ہاں —— تم نے دیکھا نہیں —— کیسے اس کا بدن چمک رہا تھا؟"

"مرکری بلب کی طرح"۔

دانتوں سے درانتی نکال کر اس نے ٹہنی پہ دندا آزمایا۔ ہم اپنے ٹھٹھرے بدن لئے اوپر تکتے رہے۔

درخت کے اُوپر جہاں چیل کا گھونسلہ تھا —— انڈہ پڑا تھا۔

پچھلے سال سورج سوا نیزے پہ آگیا تھا۔

"اُف اللہ اتنی گرمی —— چیل انڈہ چھوڑ گئی ہے"۔

"ہمارے ہاں ہر موسم شدید ہوتا ہے"۔

"یار کتنی سردی ہے"۔

"صبر کرو۔ ابھی وہ لکڑیاں پھینکے گا —— اور آگ ——"

"آگ ——" (ہم سب کے منہ سے نکلا)

"آگ جنت ہے"۔

اس نے مسکرا کے ہمیں دیکھا اور ایک ٹہنی پہ کہنی ٹکائی۔ دائیں طرف چند سوکھی شاخیں کہ پتے گئے سال سوا نیزے کی نذر ہو گئے تھے، گیارہ ہزار دو لیٹج کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔

"یخ موسم اور بجھے چہرے۔ سورج کی راہ میں گلیشیئر والی خبر ٹھیک ہی لگتی ہے"۔

"اوپر دیکھو —— وہ شاخیں کاٹ رہا ہے"۔

"شاخیں یا برف؟"

"ایک ہی بات ہے، اصل چیز تو کرنوں کی راہ بنانا ہے"۔

"ہم اپنی آگ میں کسی کو شریک نہیں کریں گے"۔

"بالکل —— بالکل ——"

"لوگ بھی تو ہمیں اپنی راحت میں شریک نہیں کرتے۔"
لوگ چاروں طرف سے گزرتے رہے، اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ ہاتھوں کو منہ سے
بھاپ دیتے۔ بغلوں میں پنجے دبائے حرارت کی جستجو کرتے لوگ ـــــ اوپر سے گرتی کٹی شاخوں پر
سے گزرتے رہے ـــــ"
ہم نے ٹہنیاں، اکٹھی کیں ـــــ چقماق سے شعلہ پیدا کیا۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر گیارہ ہزار وولٹیج کی تاروں کے پاس سے گزرتی ایک ٹہنی کو اپنی
طرف کیا ـــــ سارے علاقے کی بجلی چلی گئی۔ سارے لوگ ہماری طرح کے ہوگئے۔
ہم نے ہنگامی نمبر ملائے۔
ادھر سے کوئی جواب نہ ملا۔
لال رنگ کی گاڑیاں گھنٹیاں بجاتیں کہیں اور جارہی تھیں۔
ہم نے واویلا کیا۔ لوگوں نے کرتب جانا۔
تماشہ دیکھنے، چھتوں، بازاروں، چوراہوں پہ لوگ جمع ہوئے۔
پریس فوٹو گرافرز، کیمرے، مووی، نیوز ایجینسز۔ سوال، جواب
"جی ہاں وہ ہم میں سے تھا۔"

؟ - ؟ - ؟ - ؟

ہوٹلوں کی میزیں خالی ہوگئیں۔ دفاتر کے ہیٹر ٹھنڈے پڑ گئے۔
اس کے بدن میں گیارہ ہزار وولٹیج روشن ہوگئے۔
"اسے اتارو ـ کیا کر رہا ہے؟؟"
"اتنی سردی میں بجلی فیل کرادی۔"
ہم نے خطرے کے سارے نمبر ملائے۔
"یہ اوپر کیسے پہنچ گیا؟؟"
"دیکھو تو کیسے لٹک رہا ہے؟؟"

"وہ ہمارے سامنے اوپر گیا تھا۔ تنِ تنہا۔ اور ہم نے اسے اتارا تھا"۔
"کیا مقام پایا ہے؟"
"آدمی کا اصل مقام تو قبر ہے۔ دعائے خیر کرو"۔
"یار ـــــ اسے ٹھنڈ لگ رہی ہوگی"۔

"کہاں؟؟
"زمین کے اندر ـــــ"
"اس کا ذکر نہ کرو۔ بس ہاتھ تاپو ـــــ"
اس کی کاٹی ہوئی لکڑیوں کی آگ کے گرد بیٹھے ہم ہاتھ تاپتے ہیں۔
سورج کی راہ میں اٹکا گلیشیئر سرک رہا ہے۔
ہم ہاتھ تاپتے تاپتے اُوپر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں اس کا بدن مرکری بلب کی طرح ہے۔

گل گامش

دہلیز کے سوراخ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے۔
باہر نکلنے کے راستے بند ہیں۔
کھڑکی کی سلاخوں میں سے صرف ہاتھ باہر نکل سکتا ہے.......... آدمی نہیں۔
"جون بدلنی پڑے گی......"
"اگر جون بدلی جائے تو کون سی جنس مناسب رہے گی؟؟"
"بلی......"
"نن...... نہیں...... گلی میں بو سونگھتا کتا گلٹریا جھپٹ پڑے گا...."
"کچھوا......؟؟"
"توبہ کرو...... کیوں بچوں کو میری پشت پہ سواری کراتے ہو؟"
"گھوڑا......؟؟"
"ہاں..... یہ مناسب ہے..... مگر تانگے کا نہیں کہ پہلی ٹاپ پہ ہی وٹرنری والے پکڑ لیں..... میں تو کرپل کا گھوڑا بنوں گا....."
"مگر سوار کہاں سے لائیں گے؟؟"
"سوار..... گلی میں بہت ہیں ــــ شہر بھرا پڑا ہے ــ"
"شہر..... بے سر لوگوں کا شہر..... کیا باتیں کرتے ہو..... ہونہہ...."
"تو پھر نیولا ٹھیک ہے...."

بکھر جاتیں تب ساری سکرین ریت سے بھر جاتی۔ کبھی کوئی تنیر دانی میں جکڑا بوڑھا کھنکار کر گلا صاف کرتا تو شانوں پر شکن پڑ جاتی یا سینے پر گیلا بریز ئیر باندھے رسی کے دونوں طرف جھولتی عورت اپنے اچھے دن یاد کر کے گہری سانس لیتی تو پشت سے بندھی ڈوری تن جاتی ...... بوڑھے کی کھنگار اور عورت کا تنفس ایک بگولے کی طرح چھتوں کا محاصرہ کر کے دہشت پھیلا دیتا۔ تب تاروں سے لٹکے دھاگوں کے گچھے اور پتنگیں ساکت ہو جاتیں ...... اور سکتے میں کئی پل گزر جاتے .... دیر ہو جاتی۔ لمحہ پھیل کر زمانی فاصلوں کے درمیان طویل پل بنا دیتا جس پر یادیں کہنیوں کے بل اوپر اُٹھ کر کسی ایسے شخص کو ڈھونڈتیں جسے ان کی ضرورت ہو .... مگر اس تک پہنچنے کی راہ میں سلاخیں تھیں اور سانپ، دیر سے ... بہت دیر سے جیسے کل پرسوں ... یا زمانوں سے وہ ایک ہی جگہ تکے جا رہا ہے۔ کچھ یاد کئے جا رہا ہے .....

نیچے گلی میں نالی کے رُکے پانی سے ایک کچھوے نے اپنی فولادی پشت میں سے گردن نکال کر اس کی جانب دیکھا۔ اس لمحے موڑ سے دم ہلاتے آتے کتے نے اپنا جبڑا کھول کر دانتوں میں دھوپ کا منجن کیا اور تھڑے تلے گھس گیا کہ گلی میں داخل ہوتے ہوئے تانگے میں جُتے گھوڑے نے دم ہلا کر اپنے پسلیوں سے مکھیوں کو اڑایا تھا ......

اس نے گھوڑے کو پہچاننا چاہا ......

کل ...... پرسوں ...... یا زمانوں پہلے ...... یہ گھوڑا ...... اور سوار .....

تانگے سے سوار کو .... گلی کے ،شہر کے ..... ملک کے سب سے معمر شخص کو اتارا جا رہا تھا اس کے سر کے بال سفید ہو کر دوبارہ سیاہی پکڑ رہے تھے۔ اور جبڑوں کے اندر نئی داڑھوں کا ظہور ہو چکا تھا۔

وہ اُسے پہچاننے کے لئے چہرہ سلاخوں کے پاس لے گیا۔

لوگ معمر شخص کو سہارا دے کر اتار رہے تھے .... وہ کھڑا رہے تھے اور وہ پائیدان سے پاؤں زمین پر رکھتے ہوئے ان کا توازن قائم کر رہا تھا ..... مسکرا رہا تھا ....

اس کے پاؤں زمین پر رکھتے ہی کچھوے نے گردن اندر کر لی .... دھوپ چباتے کتے نے

"مگر دہلیز میں سانپ چھپا بیٹھا ہے . . . ."

باہر نکلنے کے راستے بند ہیں ۔

کھڑکی کی سلاخوں سے صرف ہاتھ نکل سکتا ہے . . . . . آدمی . . . . نہیں ۔

بلی . . . . چھوا . . . . . گھوڑا . . . . . نیولہ بھی نہیں کہ باہر سب کے تضاد گھوم رہے ہیں ۔

"لیکن وہ آدمی کیسے باہر نکل گیا تھا ؟"

"کون سا آدمی ——— ؟؟"

"وہی جسے کل ہم نے سالم سر کے ساتھ آخری مرتبہ دیکھا تھا ———"

"کل ؟؟؟"

"پتہ نہیں کل تھا یا پرسوں . . . . . یا زمانوں پہلے . . . . . مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے . کہ لوگوں نے اُسے حنوط کر کے میوزیم میں رکھ دیا تھا . . . ."

"ٹھہرو . . . . مجھے یاد کرنے دو . . . . ."

لیکن یاد کمرے سے باہر پھیلی دنیا کے دائرے میں گھوم رہی ہے اور باہر نکلنے کے راستے میں سانپ اور سلاخیں ۔

سلاخوں سے باہر دور تک گئی بے ربط چھتوں، بجلی کے کھمبوں، تاروں سے لٹکی پتنگوں، لنگروں اور بہت پرے انڈسٹریل ایریا کے بے مایہ دھوئیں تک نظریں دوڑا کر وہ پڑوسی کی ممٹی پہ جھولتے انٹینا کو تکنے لگا جس پر لہریں تصویریں بن رہی تھیں ۔

انٹینوں کے طویل جنگل تلے چھتوں پر، دیواروں پہ، اونگھتی دھوپ میں خشک ہونے کے لئے لوگ اپنے کپڑوں سمیت پھیلے ہوتے تھے، واشنگ مشینوں، لانڈریوں اور دھوبی گھاٹ سے لوگوں کو کپڑوں سے نکالے بغیر . . . . . کپڑوں میں دھو کر دھوپ میں پھیلا دیا گیا تھا . بوڑھے . . . . . جوان . . . . بچے کچی پکی عمر کی عورتیں چڈی . بریزئیر . صدری قمیضیں اور شیروانیاں اپنی اپنی ہیئت میں پڑی مخلوق کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے سوکھ رہی تھیں کھلی باہیں، پھیلی رانیں دھوپ کے ٹکڑوں کو چوستی تیز ہوا سے ہلتیں تو انٹینا پر گرتی تصویریں

سر اپنے پنجوں پہ رکھ لیا اور گھوڑے نے ہنہنا کر سوار کی طلب کی ..... سوار نے ..... معمر شخص نے آگے بڑھ کر اس کی پکار کا جواب دیا ..... تانگے کا ساز کھولا — جوتر ..... سینہ بند ..... کاٹھی ..... لگامیں ..... گھوڑا برہنہ مرد کی طرح گلی میں کھڑا تھا۔ دھوپ میں خشک ہوتی قمیض میں پڑا بوڑھا حسرت سے ہانپنے لگا اور بر ہنہ ڈھیر میں جیتی عورت نے اپنے سینے پر گھوڑے کی تھوتھنی سے گرتی سانس کی پھوار محسوس کی۔ معمر شخص اچک کر گھوڑے کی طرف بڑھا ایال پر ہاتھ جما کر ایک ٹانگ اوپر اٹھائی کہ لوگوں نے اسے پہچان لیا اور دوسرا پاؤں اٹھنے نہ دیا ..... لوگ جو اسے لینے آئے تھے۔ لوگ جو اس کے ساتھ آئے تھے اس پر ٹوٹ پڑے۔

چھریاں ..... تلواریں ..... گرز ..... بندوقیں ..... ڈانگیں ..... گھوڑا اپنے سوار کو حنوط ہوتے چھوڑ کر بھاگ گیا .....

اس نے سلاخوں سے ہاتھ اندر کئے اور چہرہ پیچھے ہٹاتے ہوئے گلی کے منہ پر تھوک دیا۔

ساری رات گلی میں اس کا تھوک چمکتا رہا۔ دن کی دھوپ منج ہو گئی۔ رات ..... دن اور رات ..... کل پرسوں یا زمانوں سے، گلی میں پڑی تھوک میں اپنا چہرہ دیکھتا رہا ..... جس پر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پڑوسیوں کی شب بسری کے نشان ڈھیر کی صورت میں ابھر آئے تھے ..... دائیں بائیں آگے پیچھے کے پڑوسی جن سے اس نے کل پرسوں یا زمانوں پہلے بستر پہ جانے اور کنڈی لگانے سے قبل پوچھا تھا .....

"آج آپ کے گھر میں کوئی بھوکا تو نہیں سو رہا ؟"

"اگر آپ کو روشنی چاہیئے تو میرے ہاں سے لے لیجئے"

"اگر عورت کی طلب ہے تو میری بیوی حاضر ہے"

"کوئی بیمار ہے تو مجھے تیمار داری کی اجازت دیں"

"چوروں کا خوف ہے تو آپ کے گھر کا پہرہ میں دوں گا"

اور وہ ساری رات پہرہ دیتا رہا ..... کل پرسوں یا زمانوں سے اسے یاد نہیں —— بس صرف اتنا پتہ ہے کہ نیچے گلی میں پھٹے ہوئے غباروں، موڈیس، کریم کی شیشیوں، نائٹ پلز اور

ناآسودہ خواہشوں کے خالی لفافے وقفوں کے بعد گرتے رہے۔ تھوک میں چھپاتے چہرے پہ ساتویں زرعی اور تیرھویں تعلیمی پالیسی کی فائلوں کا ڈھیر لگتا رہا۔ صبح جب بلدیہ کی گاڑی گندگی اٹھانے آتی تو پھٹے ہوئے غباروں میں بند اودرا تج بچے چیخ چیخ کر زمین سر پر اٹھا لیتے۔ ان کے والدین جلدی سے ازار بند کو گرہ دے کر پچھلے کمروں میں چلے جاتے اور جب تک بلدیہ کی گاڑی "سکول بس" کا بورڈ لگا کر واپس نہ مڑ جاتی، باہر نہ نکلتے .....

وہ باہر نکلنا چاہتا تھا مگر راستے بند تھے .... تب سے اب تک .... دہلیز میں چھپے سانپ کو مادہ بھی مل گئی .... دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا زہر پلایا تو دہلیز تلے انڈوں کے دانے چٹکنے شروع ہوئے۔ جس دن سپنی نے انڈوں سے بچے نکالے۔ گلی میں .... شہر میں .... صوبے میں .... ملک میں .... نوے ہزار بچے پیدا ہوئے۔ ان کی گردنوں میں پہ زنر زاف پیس کی تختیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ اخباروں میں خبریں نکلیں۔ ایڈیٹر کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک اس کا اپنا تھا کہ پیدا ہوتے ہی اس نے باپ کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا دوسرے کے باپ کی تلاش کے لئے اس نے اشتہار دے دیا۔ اس دن کے اداریے پورا ہفتہ نشر ہوتے رہے اور ساتویں دن مسجد میں خطبے کی جگہ پڑھے گئے۔

"لوگو محتاط رہو اس شخص سے جو اپنی طبعی عمر سے زیادہ جینے کا گر جانتا ہے نظر رکھو اس شیطان پر .... ملعون پر .... نفیتھ کالمسٹ پر جو پرانی صراطِ مستقیم کا باغی ہے اور نئی ...."

"مت سوار ہونے دو ایسے شخص کو گھوڑے کی پشت پر کہ بچ جانے کی صورت میں تباہی لاتا ہے۔"

"بند کر دو ایسے کمرے میں، اس شخص کو، جس کی کھڑکی میں زنگ آلود سلاخیں ہوں اور دہلیز میں سانپ چھپا بیٹھا ہو ....

باہر نکلنے کے راستے بند ہیں ....

"کہیں میرے ظہور کی بشارت ہی تو غلط نہیں ؟؟"

دشمن دار آدمی

پُل پار کر کے جب میں قبرستان کو جانے والی کچی سڑک پر اترا تو انہیں دیکھا۔

روز کی طرح وہ دونوں سورج کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ میں لالٹین پکڑ رکھی تھی اور دوسرا کتاب بغل میں دبائے شام کے طشت پہ پھیلتی راکھ میں ڈوب رہا تھا۔

میں نے کنکھیوں سے انہیں تاڑا اور جھاڑ کی آڑ میں چلا گیا۔ وہ دونوں غروب کی آخری کرن تھامے شام کے منظر میں بے حاصل دھبے کی طرح لگ رہے تھے۔

"آج اسے بھی بلا لو" ان میں سے ایک نے کسی تیسرے کے بارے میں سرگوشی کی۔

"راز —— دوسرے آدمی تک نہیں پہنچنا چاہیئے"۔

"دوسرا آدمی ......؟" دونوں کے لبوں سے نکلی آواز دیر تک میرے گرد گونجتی رہی اور پھر شاخوں میں اٹک گئی۔

میں نے تیسرے آدمی کو ڈھونڈنے کے لئے چاروں طرف دیکھا۔ اس لمحے ایک سیاہ بدلی سورج کے غروب پہ طلوع ہو رہی تھی۔

پُل کے آخری سرے پر جہاں لوہے کا جنگلہ ٹوٹ کر جھول رہا تھا، اک کے بوٹے، جنگلی جھاڑ اور پھلاہی کے درختوں پہ بے شمار چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

میں روز شام سمے ان کی چہکار کے سائبان تلے سے گزر کر جاتا ہوں۔ سورج جھکتے ہی پرندے اپنے آلنوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اس وقت آسمان پر کوؤں کی ڈاریں جنوب سے ایک بے ترتیب

توازن کے ساتھ پہاڑیوں کی جانب اڑتی نظر آتی ہیں..... یہ روز کا معمول ہے..... مگر اس دن جب انہیں دیکھنے کے لئے میں درخت کی آڑ میں چھپا یہ معمول ٹوٹ گیا آسمان کووّں سے صاف تھا اور درختوں پر چہکار کی جگہ سناٹا۔ ان کا آخری مکالمہ جو اس منظر کے ظہور سے قبل مجھ تک پہنچا تھا۔ میرے کان کے گرد گونجنے کے بعد جنگلی جھاڑ کی شاخوں میں الجھ گیا تھا۔

"اسے جانے دو....."

"روز ہی جاتا ہے اور خوش واپس آتا ہے۔"

میں جلدی سے آگے بڑھ کر پھلاہ کے کھردرے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اوپر شاخوں پہ بھیلی چور چپ کے جال میں پھنسی چڑیاں پروں میں سر چھپائے بیٹھی تھیں۔

"شروع کرو۔"

"ابھی سورج نہیں ڈوبا....."

"ڈوب چکا ہے کب کا..... یہ تو ہمارا احساس ہے جو اسے افق پہ ٹکا دیکھ رہا ہے۔"

"تو پھر لالٹین جلاؤ۔"

ایک کہ جس نے ہاتھ میں لالٹین پکڑی ہوئی تھی۔ ماچس جلا کر باتی کو شعلے کا اسیر کیا چمنی کے چمکیلے شیشے سے روشنی کا طویل ہاتھ نکل کر ان کے سامنے دور تک پھیل گیا۔

دوسرا کہ جس نے بغل میں کتاب دبا کر رکھی تھی، زمین پر بیٹھ گیا۔ کتاب ماتھے سے لگائی لبوں سے چومی اور اس کے صفحے الٹے۔

پہلا ـ دوسرا ـ تیسرا ـ پانچواں ـ نواں ـ گیارہواں ـ اٹھارہواں ـ ایک سو اٹھارہواں

"کل کا سبق کہاں چھوڑا تھا؟"

"کہاں چھوڑا تھا۔" ایک ہی آواز ان کے لبوں سے نکلی۔

"تمہیں پتہ ہوگا۔ تمہاری باری تھی۔"

"میں ـ نہیں ـ میں تو کھدائی کر رہا تھا۔"

"تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ـ کل تم پڑھ رہے تھے اور میں تمہاری آواز کی کدال

سے زمین سے

"اچھا دیکھو صفحے کے اندر تنکا رکھا تھا"

کتاب پڑھنے والا جلدی سے ورق اُلٹنے لگا۔ خاموش رات کے سینے میں صفحوں کی کھڑکھڑاہٹ تالیاں بجاتی، ان کے گرد ناچنے لگی۔ تنکا تلاش کرتے کرتے تھک گیا تو مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ اس کے ہلتے سر کا سایہ رات کے ماتھے پر پھٹے پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔

"تو نے کتاب کہاں رکھی تھی؟" دوسرے نے اس کے ہلتے سر کے پرچھائیں کو اپنی مشکوک آواز سے دبوچ لیا۔

"گھر پہ"

"مگر کہاں"

"الماری میں"

"کسی نے کھولی تو نہیں ؟؟"

"ہرگز نہیں۔ الماری کو تالا لگایا تھا۔ ویسے اگر کوئی کھولے بھی تو الٹے لکھے ہوئے لفظ نہیں پڑھ سکتا۔"

"تو پھر تنکا؟"

"پھر کیا کریں ؟؟"

دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور زنک میں ڈوب گئے۔ لالٹین کے گول شیشے سے باہر پھیلی روشنی کا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

"تو پھر پہلے صفحہ سے شروع کرو۔"

"پہلا صفحہ ....؟"

"میرا مطلب ہے آخری صفحہ۔ آخری لفظ۔"

"الٹی طرف سے"

"ہاں تو پھر شروع کرو۔"

ایک کہ جس کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ گوٹھ مار کے بیٹھ گیا اور آخری صفحے کا آخری لفظ گنگناتے ہوئے پیچھے کو صفحے اُلٹنے لگا۔ دوسرا اس کے قدموں کے پاس سے مٹھیاں بھر بھر کے مٹی پرے پھینکنے لگا۔

درخت کے اوپر شاخوں پہ گہری خامشی کے درمیان ہلتی لٹکی چڑیاں اور خالی آسمان کہ سارے سورج کے غروب ہوتے ہی ایک سیاہ بدلی کی گرفت میں آ گئے تھے چاروں اور پھیلے تناؤ میں میرے عقب میں پُل پردہ بھکاری آ کھڑا ہوا تھا جو ساری رات ایک ٹانگ پہ کھڑا ایک ہاتھ پھیلائے بھیک کا منتظر رہتا ہے اور جب فجر کی اذان رات کی سیاہ دیوار میں شگاف کرتی ہے تو وہ ہتھیلی پہ رات بھر گرتی شبنم زبان سے چاٹ کر شہر کی جانب چل دیتا ہے۔

جب سے پُل پار کا علاقہ قبرستان کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ راہ گیر اس راستے سے روٹھ گئے ہیں اور دوسری طرف سے چکر لگا کر شہر جاتے ہیں اور میں جو اپنے باپ کی لاش کی حفاظت کے لئے پچھلی کئی راتوں سے جاگ رہا ہوں۔ اکیلا آدمی ہوں۔ جو اس پُل سے گزر کر ادھر آتا ہوں۔

جب تک میرے باپ کا جسم گل نہیں جاتا مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے کہ میں ایک دشمن دار آدمی ہوں۔ میرے باپ کو ہل کا پھالہ، مگدر، رتھ کی گھوڑی، دو دھاری تلوار اور رنگین تنکوں کی آبائی چنگیر کے ساتھ دشمنی بھی وراثت میں ملی تھی، ہل کا پھالہ، تلوار اور چنگیر قومی عجائب گھر میں محفوظ کر دی گئی تھی۔ رنگین تنکوں کی چنگیر شہر کے ایک مہنگے شخص کی بیٹھک میں سجی ہے اور رتھ کی گھوڑی کو چور کھول کر لے گئے ہیں۔ میرے حصے میں صرف باپ کی دشمنی آئی ہے جسے میں نبھا رہا ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں رات کے اندھیرے میں دشمن میرے باپ کی تازہ لاش نکال کر نہ لے جائیں یا چور لے میں اس کی بےحرمتی نہ کریں۔ لہٰذا جب تک پاتال کی مخلوق اس کا ماس نہیں کھا جاتی مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے۔ روز رات کے وقت میں مٹی ہٹا کے سلوں کے جوڑ اکھاڑ کر قبر میں جھانکتا ہوں ۔ ۔ ۔ کل تک کیڑوں نے ماس میں سوراخ کر دیئے تھے۔ ابھی چند دن اور لگیں گے۔

پچھلے کئی دنوں سے میں ادھر جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے وقت پُل پہ بھکاری آ کھڑا ہوتا

ہے۔ اور وہ دونوں بھی کہیں سے نکل کر راستے میں آجاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی کسی کو قطعاً نہیں دیکھتا بس اپنا کام کرتا ہے۔ لیکن اس روز میں انہیں دیکھنے کے لئے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ وہاں چھپ گیا۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں کہ قبر میں کیڑوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اگر میں دیر سے بھی جاتا تو دشمنوں کو اس سے فائدہ نہ پہنچتا کہ وار کرنے کا موقع نکل چکا تھا لاش گل سڑ رہی تھی اور میں کئی دنوں بعد اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ طمانیت کے اس احساس سے شرابور میں تنے سے لگ کر انہیں تکنے لگا، ہمارے پیچھے پل اور پرے شہر کی آوازیں تنگ گلیوں تاریک ڈیوڑھیوں میں سکڑ گئی تھیں۔

"ذرا اونچی کر دو"

کتاب پڑھنے والے نے رکے بغیر ہاتھ بڑھا کر باٹی اونچی کر دی۔ دوسرا اور شدت کے ساتھ زمین کھودنے لگا۔

"روشنی کم ہے"

"باتیں کم کرو۔ وقت کم ہے"

"ابھی تو بہت سی کھدائی باقی ہے"۔

مٹی کی ڈھلوان ان کے گرد بلند ہوتی رہی۔

کتاب پڑھنے والے کے لفظوں میں پوشیدہ قوت کھدائی کرنے والے ہاتھوں میں حلول کر کے زمین کا سینہ چیرتی رہی۔ دھیرے دھیرے ان کے سائے مٹی کے بلند ہوتے ڈھیر میں غائب ہونے لگے۔ اب صرف انسانی آواز کی سرسراہٹ تھی جو الٹے حروف کے سحر کی اسیر ہو کر سازش کی تکمیل کر رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر گذر گئی۔ لالٹین کا تیل اور الٹی پڑھی جانے والی کتاب کے صفحات ختم ہو گئے۔

پل پہ کھڑے بھکاری نے اپنا رات بھر سے اٹھایا ہوا پاؤں زمین پہ رکھا تو فضا دھمک سے لرز گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اپنی جلتی بجھتی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں درخت کے تنے سے ہٹ کر آگے بڑھا تو اس نے قہقہہ لگا کر اپنی ہتھیلی پہ جمی شبنم چاٹی اور شہر کی طرف چل دیا۔

میں نے قبرستان کی راہ میں پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ مٹی کے ڈھیر سے ایک ہیولا ابھرا جس نے ساری فضا کو اپنی ھنہناہٹ سے نوچ ڈالا۔ ہماری آبائی مشکی گھوڑی پر سوار، ہاتھ میں لالٹین بغل میں کتاب اور گھوڑی کی دم سے بندھا لاشہ۔

چاروں طرف گرتی شمعوں کی بجلیاں آگ کے بوٹوں کو راکھ کر گئیں۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ نصف یا آخری، یہ سورج کے غروب کا تھا یا طلوع کا پرندوں کا گھونسلوں کی طرف آنے کا وقت تھا یا، دانے کی تلاش میں دور دیس کو جانے کی گھڑی، میں نہ جان سکا ... مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ اس رات جب میں واپس آ رہا تھا تو چڑیاں دہشت سے چیخ رہی تھیں اور آسمان کوؤں سے بھرا ہوا تھا لیکن قبر خالی تھی۔ اگلی صبح میں نے باپ کی بچی کھچی وراثت اپنے بیٹے کو سونپ دی کہ یہی ہماری آبائی روایت ہے۔

بیج دینے والا

اس نے سوال کیا۔
"اس سال کیا کاشت کرو گے ——— جَو یا گندم؟"
جواب بہت طویل ہے۔ موسموں کی متضاد فصلوں کے درمیان پھیلا طویل جواب، جس کی تلاش میں، میں وہ سارے کھیت عبور کر گیا۔ جنہیں ہل دینے کے بعد بیج کا منتظر چھوڑ دیا گیا تھا۔
کسان کھیتوں کی سیاڑ نکالنے کے بعد حجرے میں آ بیٹھے تھے۔
بادل سمندروں سے اُٹھ کر آسمان کی چوپال میں برسنے کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے
کسان اور بادل دونوں منتظر تھے کہ اس سال کیا کاشت کیا جائے گا؟
"ہم نے گزرے سال گندم بوئی تھی اور جَو کاٹی"
"کہیں زراعت والوں نے بیج تو غلط تقسیم نہیں کر دیئے تھے؟"
تب جرگے نے فیصلہ کیا کہ مجھے جانا چاہیئے کہ ان کی نظر میں، میں سب سے معتبر تھا۔
میں ہوا کی رفتار دیکھ کر بادل کی آمد کا پتہ لگا لیتا ہوں۔
مٹی کا رنگ دیکھ کر فصل کی قیمت بتا دیتا ہوں۔
میں نے ان سب سے زیادہ صدیاں دیکھی ہیں۔
سات زمینوں کا پانی پیا ہے۔
"اور ست رنگی مٹی کے موزے پہنے ہیں۔"

اسی لئے جب گندم کی جگہ جَو پیدا ہوئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے جانا چاہیئے اور بیج
کی قسمت کا پتہ لگانا چاہیئے۔
اگلے دن میں اپنے دیکھے بھالے شہر میں تھا۔
ساتویں مرتبہ دریافت کیا ہوا شہر جو خاموشی سے کھنڈر بن جاتا ہے اور پھر کسی دن اچانک
اسے دریافت کر کے تاریخی حیثیت دے دی جاتی ہے۔
اس دیکھے بھالے شہر میں محکمہ زراعت کا دفتر ڈھونڈتے میں مشکل پیش نہ آئی کہ میں بڑے گے
والوں کی نظر میں سب سے زیادہ باخبر تھا۔
چپڑاسی سے اجازت لے کر کلرک کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے مجھے دیکھ کر اپنے گلے
سے بندھی زنجیر جس کا سرا دوسرے کمرے میں اٹکا ہوا تھا، سر ہلایا۔
میرے بولنے سے قبل ہی اس نے میری ہتھیلیوں سے جَو کے دانے اٹھائے جو گندم کی جگہ اُگ
آئے تھے اور بولا۔
"اس طرح شکایتیں بہت آ رہی ہیں۔ آج کل۔" تم یہاں ٹھہرو میں اپنے افسر سے پتہ کرتا
ہوں۔ وہ اس کے ماہر ہیں۔"
کلرک زنجیر گھسیٹتا دوسرے کمرے کی طرف بڑھا اور چق اٹھا کر اندر چلا گیا
میں چپ چاپ فیصلے کا منتظر
ادھر کسان اور بادل میری راہ دیکھ رہے تھے۔
موسم تیزی سے گزر رہا تھا، جس کا اثر میرے گھر پر بھی پڑ رہا تھا۔ جہاں میں بتا تنور گرم
پیڑوں کے انتظار میں چھوڑ آیا تھا کہ کسی وقت بھی جَو کی قسمت میں گندم بننا لکھا جا سکتا ہے
تنور کے پاس نکو سوکھی ٹہنیوں کے جھاڑ کو توڑ رہا ہو گا۔
صحن میں مرغیاں کنکناتی پھر رہی ہوں گی۔
میں اسے کہہ آیا تھا کہ میری واپسی تک تندور گرم رکھے عام طور پر یہ کام اس کی ماں یا بہن
کرتی ہے لیکن وہ اندر کمرے میں مہمانوں کے ساتھ مصروف ہیں۔

آج انہوں نے ببلی کا رشتہ لینے آنا تھا۔

ساری چیزیں تیار ہو چکی تھیں۔

قصائی نے سویرے ویڑی ذبح کی تھی۔ گو کہ ضلع کے حاکم کے بندے سارا گوشت لے گئے تھے لیکن میرے لئے دو کھُر اُس نے بچائیے تھے جن کا شوربا تیار ہو چکا تھا۔ ببلی کی ماں نے تمبر کی چٹنی تیار کر لی تھی اور منہ میٹھا کرنے کے لئے چولہے پر گڑ کا حلوہ چڑھا دیا ہو گا۔

وہ بڑی مہمان نواز قسم کی عورت ہے۔

اس کے گھر سے آج تک کوئی انسان اور کوئی کُتا اپنی حاجت پوری کئے بغیر واپس نہیں گیا اور آج تو بڑے مرتبہ والے مہمان آئے ہیں جن کے لئے گندم کی روٹیاں لازمی ہیں۔

اس سے پہلے کہ کہیں ببلی کی آنکھ لڑے یا اس کے چہرے کی لالی زردی میں ڈھلے ہم نے سوچا ہے کہ اسے بیاہ دیا جائے۔

بڑی غلام قسم کی لڑکی ہے ——— اس نے صرف اپنی پیدائش کے وقت رو کر اپنی آئندہ کی زندگی کے بارے میں ناخوشی کا اظہار کیا تھا۔

اس کی یہ پہلی اور آخری چیخ مجھے ابھی تک یاد ہے۔

میں صحن میں ڈھینگروں کے پاس بے کلی سے ٹہل رہا تھا۔ متلوّن مزاج مرغیوں کو بار بار کمرے کی طرف جانے سے روکتے ہوئے کبھی کبھی میرے دل میں اندر کمرے میں جھانکنے کی خواہش اٹھتی جہاں اُمت میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اتنے میں ہلکی سی پُر تاثیر چیخ کے پیچھے پیچھے دائی ہاتھوں کو کپڑے سے صاف کرتی باہر نکلی اور میری طرف دیکھے بغیر باہر جاتے ہوئے بولی۔

"اللہ کی رضا ہے ——— خُدا نے دھی دی ہے۔"

میں نے ڈھینگرہ کو زور سے ٹھوکر ماری اور اپنے جھکے ہوئے شملے کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

لیکن یہاں اس کمرے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ہنکارا نہیں بھر سکتا۔ کیا پتہ انہیں جَو اور گندم کی اصل کا فیصلہ کرنے میں کتنی دِقت پیش آ رہی ہو۔ میرے ہنکارا بھرنے سے ان کا حساب غلط ہو

سکتا ہے۔

جس طرح اندر کمرے میں وہ جو اور گندم کی تقدیر کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہیں۔ گھر میں نکو کی ماں مہمانوں کی خاطر میں مصروف ہو گی۔

مہمان میری غیر موجودگی کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے۔

وہ انہیں فخر سے بتا رہی ہو گی کہ کس طرح جرگے نے میرے سپرد ایک اہم کام لگایا ہے۔

مجھے شہر بھیجا ہے کہ پتہ کروں کہ کیوں گندم کی جگہ جو اُگ آتے ہیں۔

بلی اندر جانے سے کترا رہی ہو گی۔ چولہے کے پاس بیٹھے کان لمبے کر کے وہ ان کی باتیں سُننے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ جب کہ باہر تندور کے پاس نکو معاملے سے لاپرواہ بیری کے جھاڑ سے مری شاخیں توڑ کر تندور کا بالن اتار رہا ہو گا۔

میں اسے تاکید کر آیا تھا کہ تندور روشن رکھنا کہ واپسی پہ میں ہاتھوں پہ گندم کے پیڑے لاؤں گا کہ مہمانوں کی تواضع مقصود ہے۔ اگر واپسی پر تندور بجھ گیا اور مہمانوں کی تواضع میں کمی رہ گئی تو کیا پتہ وہ بلی کا رشتہ ہی نامنظور کر دیں۔

اب میرے اندر جرگہ اکٹھا کرنے یا جوان بیٹی گھر میں بٹھانے کی تاب نہیں اور پھر اس کے بعد نکو کی بھی تو باری ہے، اگلے سال جب گندم بو کر گندم کاٹیں گے تو اس کے بارے میں سوچیں گے لیکن اس کا انحصار اس کلرک کے جواب پر ہے جو اندر کمرے میں اپنے افسر کے پاس گیا ہے۔

اندر کمرے میں چُپ کی چق کے پیچھے وہ بیج کے بارے میں غور کر رہے ہوں گے انہیں شاید میرے انتظار کی اذیت کا احساس نہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ گھر میں کون کون میرا منتظر ہے۔

اتنی دیر ہو چلی ہے۔

نکو نے جھاڑ کاٹ کر صاف کر دیا ہو گا۔ سوکھی شاخوں کو تڑتڑاتے تندور میں ڈالنے کے بعد بے ربط کھردرے تنے کو پاؤں سے پرے دھکیل دیا ہو گا ایسا کرتے وقت اس کے

ذہن میں بیری کا بوٹا اُگ آئے گا جسے اس نے بچپن میں لگایا تھا اور جسے ہم نے کل کاٹ ڈالا تھا۔

ہم اسے ہرگز نہ کاٹتے اگر اس پر بیر لگتے لیکن اسے تو آکاس بیل نے دق لگا دی تھی سوکھی مریل بیری پھل دینے سے پہلے ہی بالن بن گئی۔ ہم اسے کاٹ کر گھر لے آئے تھے۔

اس کی مریل شاخوں نے تندور گرم کر رکھا ہے جس کے نیچے کا گول تنا کاٹ کر تختہ بنایا جائے گا کہ گھر میں اس کی ضرورت ہے۔

کھردرے بے ربط تنے کو پاؤں سے پرے دھکیلتے ہوئے نکّو کے ذہن میں اس آری کا خیال آئے گا جس سے ہم نے بیری کاٹی تھی۔ آری کے ضعیف دندوں کو تیز کرنے کے لئے اس نے دتّی تیار کر رکھی تھی۔ صرف میرے آنے کی دیر تھی کہ میری مدد کے بغیر تنے کو تناسب دینا مشکل ہے اس کے بعد ہم بیلوں کی آنکھوں کے لئے کھوپے بُنیں گے۔ جن کی ڈوریاں اکھڑ چکی ہیں۔ شام تک سارے کام مُکا کے ہم خوب سوئیں گے اور صبح منہ اندھیرے برسنے کو تیار بادلوں کے سائے تلے کھیتوں کو نکل جائیں گے۔

بیلوں کی آنکھوں پر چڑھے کھوپے اور ہماری آنکھوں میں پھیلی امید کا نشہ نہیں دیکھنے دے گا کہ ہم کیا بو رہے ہیں۔ گندم . . . . یا جَو؟

"یار ــــــ اس سال تم کیا کاشت کرو گے؟"

"اس سال تو مجھے معلوم نہیں، پچھلی دفعہ گندم بوئی تھی اور جَو کاٹی"۔

"واقعی ــــــ یا مذاق کر رہے ہو"۔

"تیرا میرا مذاق تھوڑا ہی ہے"۔

"یار پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا"۔

"کیا ــــــ ؟"

"یہی نا کہ گنے کی گانٹھ لگاؤ اور رنڑی کاٹو"۔

"زمین کی تاثیر بدل گئی ہے اسی لئے تو چیزوں کی حیثیت بدل گئی ہے"۔

یار ـــــ کہیں سے پتہ کرو۔ بیج ہی خراب نہ ہوں"
"بیج ـــــ یار یہ بیج پہلے کہاں سے آتے تھے"
"مجھے زیادہ پتہ نہیں ـــــ ایک دفعہ چاچے نے بتایا تھا کہ ـــــ"
"کیا بتایا تھا؟"
"جب مالیہ دگنا ہو گیا تھا اور ضلع کے حاکم کے بندے آئے تھے فصل اٹھانے کے لئے
... جاتی دفعہ بیج بھی لے گئے اور کہہ گئے کہ آئندہ سے بیج سرکار دیا کرے گی"
"یہ تمہاری حیانی کی بات ہے"
"میں اس وقت بہت چھوٹا تھا"
"پھر کیا ہوا؟"
"ہونا کیا ـــــ شروع میں تو معاملہ ٹھیک چلتا رہا۔ ایک آدھ فصل بھی زیادہ
ہوئی پھر گندم کی جگہ جو ـــــ"

میں اس کی بات پر ہنسنا چاہتا تھا مگر چپ رہا کہ میں ان کی نگاہ میں سب سے جہاندیدہ
تھا۔

میں ہوا کی چال دیکھ کر بادل کی خبر پا لیتا ہوں۔
مٹی کا رنگ دیکھ کر غلے کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔
میں نے ان سب سے زیادہ صدیاں دیکھی ہیں۔
سات زمینوں کا پانی پیا ہے۔
اور ست رنگی مٹی کے موزے پہنے ہیں۔

لیکن یہ ان کا خیال تھا پتہ نہیں انہیں کیوں میرے بارے میں یہ غلط فہمی تھی حالانکہ
ان سب کی طرح پیدائش کے فوراً بعد میرے کان سل کے، ان میں ڈوریاں ڈال دی گئی
تھیں۔ اور اب جب کہ انہوں نے مجھے شہر بھیجا ہے کہ جاؤں اور پتہ لگاؤں کہ کیوں گندم کی
جگہ جو اگ آتے ہیں تو بار بار میں حجروں میں بیٹھے لوگوں، آسمانوں کی چوپال میں برسنے کو تیار

بادلوں اور اپنے گھر کا سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں ۔

اندر کمرے میں انہیں بہت دیر ہو چلی ہے ۔

میں ہنکارا بھرے بغیر جھکی جھکی نظریں چاروں طرف دوڑاتا ہوں ۔ دبے پاؤں کمرے میں حرکت کرتا ہوں اور چپ کی چق کے ساتھ لگ کر اندر جھانکتا ہوں کہ اب انتظار گناہ محسوس ہونے لگا ہے ۔

چق سے پرے کمرے کے مدہم اجالے میں کلرک اور اس کا افسر سر جھکائے کسی اجنبی کے سامنے کھڑے ہیں ۔ اجنبی اپنے سر سے ایک بڑا سا ہیٹ اتار کر اس میں جو کے دانے ڈال رہا ہے ۔ میں ہیٹ پر بنے ستارے گننے لگتا ہوں ۔

ستاروں والا ہیٹ مجھے بہت عجیب لگتا ہے ۔

ایک ۔ دو ۔ تین ۔ پانچ ۔ دس ۔ بیس ۔ تیس ۔ چالیس ۔ پنتالیس ۔ پچاس ۔ باون ۔ باون تارے میری آنکھوں کے تاریک آسمان پر جھلملاتے ہیں ———

تیزی سے گزرتا ہوا وقت میرا شانہ دبوچ کر مجھے پرانی جگہ پر کھڑا کر دیتا ہے ۔

برسنے کو تیار بادل آسمان کی چوپال میں حرکت کرتے ہیں ۔

حجروں میں منتظر کسان میری راہ تک رہے ہیں ۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں نکو تندور روشن رکھنے کے لئے اپنے آپ کو بالن نہ بنا دے ۔

بوڑھی برگزیدہ آنکھیں

فقیر سارا دن گلی میں چارپائی ڈالے، چلم سامنے رکھے، تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا۔ لیٹا رہتا۔

جب وہ بیٹھا ہوتا تو دور تک پھیلی گلی کی اِک اِک شئے کا عکس اس کی بوڑھی برگزیدہ آنکھوں میں اُبھر آتا اور جب وہ لیٹا ہوتا تو آسمان کا آئینہ زمین کی ساری چیزوں کا نقش اس کی آنکھوں پر ڈالتا رہتا۔ صبح سویرے جب ابھی دھوپ چھتوں سے لٹک کر صحنوں میں نہیں اتری ہوتی تو اس کے وارث اس کی چارپائی ڈنگا ڈولی کر کے اٹھاتے باہر نکلتے اور گلی میں لا رکھتے۔ اس وقت رفیق گجر گھروں میں دودھ دے کر خالی بلٹوئے کھڑکاتا واپس آ رہا ہوتا اور نان والا میدے کے پیڑے بنا کر کلچے لگانے کی تیاری کر رہا ہوتا تب بہت آہستہ آہستہ لوگ جاگنے لگتے۔ جو جاگ اٹھتے وہ گھروں سے باہر یا چھتوں کا رخ کرتے ایک جادوئی عمل کے ساتھ بچے اور بڑے ناشتہ کے بعد دفتروں، سکولوں اور کارخانوں کی جانب لپکتے اور وہ انہیں جاتے ہوئے تکتا رہتا۔ گنتا رہتا اسے جتنی گنتی یاد تھی گن چکتا تو انگلیوں کے جوڑوں پر ان کا حساب لگاتا اور پھر مطمئن ہو کر مٹھیاں بند کر لیتا کہ جیسے گلی کی ساری مخلوق مٹھیوں میں منتقل ہو گئی ہو۔ دوپہر شروع ہوتے ہی عورتیں بالکنیوں، دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانک کر آپس میں باتیں کرتیں۔ ابھی ان کی آوازوں کی گونج گلی کے روڑوں سے ٹکرا رہی ہوتی کہ چولہوں پر چڑھی ہانڈیوں کی خوشبو انہیں اپنی جانب کھینچ لیتی اور پھر روز کی طرح لوگوں کی واپسی کا سمے آ جاتا فقیر انہیں واپس آتے تکتا رہتا گنتا رہتا اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ جتنے نفوس گئے تھے اتنے ہی واپس آئے ہیں۔ تو اطمینان کی طویل سانس

لے کر اٹھ بیٹھتا گھونٹ مارتا اور چلم تازہ کرنے لگ جاتا۔ دن کا درمیانی وقفہ قیلولے کے لئے وقف تھا لوگ اس کے شدید عادی ہو چکے تھے۔ خاموش گلی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ بھی قیلولہ کر رہی ہو فقیرا اس وقفہ میں چارپائی پر چت لیٹ کر آسمان کو تکتا رہتا جہاں سارے شہر کی تصویریں پھیلی ہوتیں اس وقت زمین کے سارے منظر، سارے رنگ آسمان پر چڑھ جاتے پرانے مندروں، نئی مسجدوں اونچی عمارتوں اور رواں دواں سڑکوں کے سارے روپ آسمان کے ناطے اس کی آنکھوں میں اترتے رہتے اور یہی وہ وقت ہوتا جب میں گلی اترتا۔

ایسی ہی ایک اجاڑ دوپہر کو جب لوگ دانتے میں آسیب کے ہاتھوں اپنا پینڈا کھوٹا کر چکتے یا گھروں میں قیلولہ کر رہے ہوتے تو میں گلی میں نکلتا ایسی ہی ایک دوپہر تھی جب میں نے وہ منظر دیکھا۔

مجھے وہ دن وہ مہینہ وہ سال یاد نہیں صرف ڈوبی گلی کا منظر یاد ہے جس میں فقیرا چت پڑا آسمان کو گھور رہا تھا۔ اس کے تمباکو کی گتھی چارپائی کے میلے تکیے کے پاس کہنی کے قریب پائے سے لٹک رہی تھی اور چلم کی ٹوپی میں ابھی ابھی اس نے جو تمباکو بھرا تھا اس کی راکھ لبالب ہو رہی تھی۔

ایسی ہی ایک گھڑی تھی۔ گلی خالی تھی جیسے خشک کنویں کی تہہ ہوتی ہے۔ اس خالی گلی میں ابھی میں اترا ہی تھا کہ سامنے تپتی چھت پر کوئی ننگے پاؤں میرا منتظر تھا۔

اس خالی خشک کنویں کی تہہ جیسی گلی میں ابھی میں نے ایک پاؤں رکھا ہی تھا کہ وہ دونوں کالے پٹکے باندھے ہاتھوں میں گینتی اور بیلچہ لئے موڑ سے ظاہر ہوئے۔ انہوں نے سازشی آنکھوں سے فقیرا کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے گزر کر اس جگہ جہاں میں نے ایک پاؤں رکھا تھا۔ جار کے میرے اور ان کے درمیان اس چوکھٹ کی فصیل حائل تھی۔ جس کے دروازے کے پیچھے میں کھڑا تھا

ابھی میں نے گلی میں ایک پاؤں رکھا ہی تھا کہ ان کے کالے پٹکوں میں چھپے سر مجھے نظر آگئے میرا پاؤں واپس چوکھٹ کے اندر چلا گیا میں منتظر رہا کہ وہ گزر یں تو میں باہر جاؤں اور سامنے چھت پر پہنچوں جہاں وہ ننگے پاؤں میرے انتظار میں ہے۔ انہوں نے دور تک پھیلی سنسان

گلی کو نگاہوں سے تولا اور پھر چھان پھٹک کر نیقرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ مرتا بھی نہیں"۔۔۔۔۔ ایک بولا

"اس کا مرنا جینا ایک برابر ہے"۔۔۔۔۔ دوسرے نے گینتی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے"؟

"اس کے وارثوں نے اسے فراموش کر دیا ہے"۔

"اگر اس نے دیکھ لیا تو"؟

"اس کا دیکھنا نہ دیکھنا ایک برابر ہے اور جتنی دیر میں وہ دیکھے گا ہم جگہ ڈھونڈ لیں گے"۔

دونوں جھک کر مٹی سونگھنے لگے ان کے گھٹنے زمین کو چھو رہے اور بڑے بڑے بدوضع کولہے پیچھے سے یوں اُوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے زمین سے بدفعلی کر رہے ہوں۔ ہولے ہولے گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا کر وہ واپس اس جگہ آ رکے جہاں میں کھڑا تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے ان کے دھڑ دھوپ میں بہت واضح نظر آ رہے تھے مگر یہ قیلولے کا وقت تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ نقشہ میں یہی گلی تھی؟

"یقین ـــــ ہونہہ ـــــ نقشہ بنانے والوں میں میں بھی شامل تھا"۔

"تو پھر اندر سے آواز کیوں نہیں آ رہی؟ بُو کیوں محسوس نہیں ہوتی؟

"آواز ـــــ کس چیز کی آواز ـــــ؟

"سُرنگ کھودنے کی"۔

"سرنگ تو کھودی جا چکی ہے۔۔

"تو پھر بو آنی چاہیئے بُو۔۔۔۔۔ بارود کی"۔

"وہی تو میں سونگھ رہا ہوں ـــــ ایک نے ذرا تلخی سے کہا۔۔

"میں نے ساری توجہ آواز پر دے رکھی تھی ـــــ کیا پتہ مجھے بُو آئی ہو اور میں ـــــ اچھا پھر دیکھتے ہیں"۔

وہ دونوں پہلے سجدے میں گئے اور پھر بالکل جُھک کر زمین سے ناک چپکا دی اور مخالف

سمتوں میں رینگنے لگے۔

اس وقت نیرا آسمان کے آئینہ میں زمین کا عکس دیکھ رہا تھا۔
سامنے چھت پر ننگے پاؤں کوئی میرا منتظر تھا۔
اور میں دروازے کی اوٹ سے لگا سہما سہما سا انہیں دیکھ رہا تھا۔
وہ دونوں گلی کی خاک سونگھتے سونگھتے واپس اس جگہ پر آ گئے۔
"مجھے تو اس جگہ پر شبہ ہے"—— ایک تھکن بھری آواز میں بولا۔
لیکن مجھے یقین ہے —— یہاں کی مٹی سے اجنبی —— نامانوس سی بو آ رہی ہے"۔۔
"تو پھر کھود دوں ——؟"
"اگر کسی نے دیکھ لیا تو ؟"
"تو کہیں گے کہ پانی کی لائن چیک کر رہے ہیں"۔
"اگر لائن یہاں سے نہ گزرتی ہو تو پھر ——؟"
"تو ۔۔۔۔ تت ۔۔۔۔ تو گیس کی لائن —— ویسے تم فکر نہ کرو۔ اس گلی کے لوگوں کو اتنا احساس ہی نہیں رہا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ پانی کی لائن گزرتی ہے یا زہر کی!"
"پھر بھی کسی نے پوچھ لیا تو ؟"
"اس وقت گلی خالی ہے ۔۔۔
"کوئی بھی آ سکتا ہے ؟
"لوگ قیلولہ کر رہے ہیں۔ اور ضروری نہیں جو آئے وہ پوچھے بھی"۔
"ویسے بات تو ٹھیک ہے۔ روایت تو یہی ہے مگر مجھے اس بڈھے سے چڑ ہو رہی ہے"۔
"پرانا ناکارہ بڈھا—— ویسے سُنا ہے کہ اس کو گزرے زمانوں کی باتیں یاد ہیں۔ یہ اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب ہمارے لوگوں نے پہلی بار یہاں کی مٹی کو مفتوح کیا تھا یہ بڈھا لوگوں کو گئے زمانوں کے قصّے سناتا ہے اور لوگ ہنستے ہیں۔ اس پر"۔
"اچھا باتیں پھر کریں گے —— کھدائی شروع کریں ۔۔۔

" ویسے میرا مشورہ ہے کہ رات کو کام کیا جائے . . .

" قطعاً نہیں رات کو چوکیدار ہوتے ہیں ــــ آواز سے شبہ ہوگا ــ دن دیہاڑے شک کا امکان کم ہے اور ویسے بھی ہم پانی کی لائن تلاش کر رہے ہیں "

" تو پھر شروع کریں ــــ اندر سے زمین پتہ نہیں کتنی سخت ہو "

ہمیں کون سی زیادہ کھدائی کرنی ہے ایک فٹ ہی تو کھودنا ہے "

تب انہوں نے فیصلہ کن نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا ایک نے گینتی اٹھا کر پوری قوت سے پھالہ زمین میں مارا ۔

سنسان گلی سے ــــ فقیرا کی آنکھوں سے ــــ سامنے چھت پر منتظر ہستی کے وجود سے میرے انگ انگ سے ایک فریاد نکلی اور زمین سے آسمان تک ہر چیز کو پُرالم کلادے میں بھر کر چاروں سمت پھیل گئی ۔

تب انہوں نے دوسرا وار کیا ننھے ننھے کنکر اور پوٹا بھر دھول بے بضاعتی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری اور گلی کا ماتھا زخمی ہوتا گیا ۔ زخم گہرا ہونے لگا ۔ اس گہرے ہوتے زخم کے ساتھ ساتھ ہماری فریاد کا دھواں زمین سے آسمان تک اس سرخ بدلی کی طرح پھیل گیا جو قتل کی بشارت دیتی ہے ۔

تیسرے وار پر گلی نے کراہ کر دم توڑ دیا ۔ اور پھر اس کے بعد وہ جنونیوں کی طرح زمین کھودنے لگے ۔

فقیرا آسمان کو تکے جا رہا تھا ۔ اور میں اسے ، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنے گرد مٹی کا ڈھیر بنا لیا ۔ اور اس میں اتر گئے . . .

میں گلی میں اترنا چاہتا ہوں کہ سامنے چھت پر کوئی میرا منتظر تھا ۔ مگر راہ میں مٹی کا ڈھیر حائل ہو چکا تھا ۔ ہماری فریاد کا دھواں زمین و آسمان کے مابین تسخیر ہوتی فصیل کی طرح ڈول رہا تھا ۔ اور اس فصیل کے اندر بسنے والے پرسکون دوپہر گزار رہے تھے . . .

میں نے اپنے سامنے مٹی کے ڈھیر میں انہیں جس طرح گم ہوتے دیکھا بالکل اسی طرح انہیں اور

ان جیسے ہزاروں کو ایک روانی کے ساتھ باہر نکلتے دیکھا۔ کاپے پھلکے باندھے مشکوک چادریں لئے ایک کے بعد دوسرا، تیسرا، ساتواں، سوواں، ہزاروں وہ چیونٹیوں کی طرح کھدی ہوئی زمین سے نکلتے اور گلی کے دونوں سروں کی جانب شہر کی جانب باغوں سے خالی وطن کی جانب پھیلتے گئے۔

وقت بجورج گلی میں آکر جم گیا تھا اور ہماری فریاد اس پر گرد بن کر گر رہی تھی بجانے کتنی دیر گزر گئی وہ چھت پہ میرا انتظار کرتے کرتے واپس ...... اور وہ دونوں اپنا کام کر کے گلی کے گڑھے سے باہر ـــ

مٹی برابر کر کے انہوں نے فتحمندی سے فیقرا کو گھورا، مسکرائے اور شہر کی طرف چل دیئے...

فیقرا ابھی تک آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ اور میں اسے ..... کہ ابھی تک نہ تو اس نے پہلو بدلا تھا اور نہ ہی چلم تازہ کی تھی۔

جو کھٹ میرا پاؤں کاٹنے لگی تو میں گلی میں نکل آیا کہ راہ میں حائل مٹی کا ڈھیر برابر ہو چکا تھا گلی اپنی پرانی حالت پہ آچکی تھی۔ بچے ایک ایک کر کے گھروں سے باہر نکل رہے تھے۔ مردوں کی باتیں عورتوں کی سرگوشیاں ڈوبتی دھوپ کے ساتھ ساتھ پیلی ہو رہی تھیں ـــ

فیقرا کی چارپائی کے پاس پہنچ کر میں پل بھر کے لئے رکا..... چلا اور پھر ٹھہر گیا۔ اس کی پتھرائی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں، ٹھوڑی، سینے اور تکیے پہ رکھی کہنی سے ہوتے ہوتے گلی کی خشک ہوئی خاک میں بوند بوند جذب ہو رہے تھے۔ اس کی بوڑھی برگزیدہ آنکھوں میں زمین و آسمان کے سارے رنگ و روپ زوال کا شکار ہو رہے تھے۔

اس نے کانپتے ہونٹوں سے کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس نے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیری اور پھر کچھ کہنا چاہا کہ اس کے وارث آگئے اور چارپائی ڈنگا ڈولی کر کے اٹھانے لگے..

"رک ـــ رکو ـــ" اچانک وہ نزع کے عالم میں بولا وارثوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور رک گئے۔

"وہ گلی" فیقرا نے اشارہ کیا اور وہ سارے کے سارے اس نے شہر کی طرف اشارہ کیا۔ آستین

جھاڑی اور بدن کی بکھری قوتیں اکٹھی کرنے کی خاطر چپ ہو گیا۔

"بڈھے کو دھوپ لگ گئی ہے ...."۔ اس کے وارثوں میں سے ایک بولا "وہ تمہارے دن اور تمہاری راتیں چھیننے کے لئے آ چکے ہیں۔ اور تمہارے شہر میں داخل ہو چکے ہیں"۔ فقیرا نے بے بسی اور غصّے سے اسے گھورا۔ اس سے پوچھو، اس نے میری جانب اشارہ کیا تو میں سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

"آج دھوپ تیز تھی ناں میں نہ کہتا تھا گلی میں مت ڈالو گھوم گیا ناں دماغ لگ گئی لو ....

وارثوں میں ایک اونچی کرخت آواز میں بولا۔

"گلی میں نہ ڈالو تو ضد کرتا ہے"۔ دوسرے نے کہا۔

"اچھا .... اچھا .... اب اٹھاؤ ...." سارے مل کر بولے۔

انہوں نے فقیرا کو اٹھایا اور اندر لے گئے مگر اس اٹھانے اور اندر لے جانے کے درمیانی لمحہ میں میں نے دیکھا کہ اس کی ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو چکا ہے آسمان اس کی آنکھوں میں ڈوب چکا تھا اور زمین اس کے لئے اپنا سینہ کھول چکی تھی۔

اس طرح کی دوپہروں میں اکثر! میں اسے چھت پر ملنے جایا کرتا ہوں۔ پہ پتہ نہیں کیوں مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی دن اچانک باغوں سے خالی وطن میں میرے اس واحد باغ کو اجاڑنے کے لئے اندر اور باہر سے مشکوک ٹیکوں والے آئیں گے اور .... اور

سنا ہے کہ وہ عورتوں کو مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کر لیتے ہیں سُنا تو یہ بھی ہے کہ یہ دن جو ہم بسر کرتے ہیں یہ رات جو ہم پر بیتتی ہے اب ہماری نہیں رہی۔

اور وہ بوڑھی برگزیدہ آنکھوں والا شخص جو سارا دن گلی میں چارپائی بچھائے چلم سامنے رکھے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا .... لیٹا رہتا تھا۔

سُنا ہے کہ اب کسی کو یاد بھی نہیں رہا۔

منحوس منظر کے لیے بددعا

اگر کھڑکی بند ہوتی تو وہ منظر کبھی نظر نہ آتا۔

ہم سارے نیوز ڈیسک کے گرد بیٹھے تھے۔

خبریں ــــ خبریں ــــ دو کالمی، ایک کالمی ــــ پانچ کالمی ــــ سُرخیاں پنسلوں کی سرسراہٹ کاغذوں کی پھڑپھڑاہٹ کے بیچوں بیچ ٹیلی پرنٹر کی آواز، پنکھوں کی گھوں گھوں اور میڈیم ویو پہ بجتا ریڈیو۔

اس صوتی منظر کے درمیان، ہم میں سے کسی نے باہر دیکھا۔

اگر کھڑکی بند ہوتی تو وہ منظر کبھی نظر نہ آتا۔

ان دنوں شام ہوتے ہی شہر میں دھواں سا پھیلنے لگتا اور شمال مغرب کی سمت جہاں پہاڑیوں کی اوٹ میں سورج ڈوبا کرتا ایک عجیب سا رنگ اُبھرنے لگتا تھا۔

گلابی سُرخ اور ہلکا نیلا سا رنگ جو آپس میں مل کر لہو کی طرح گاڑھا ہونے لگتا۔ اس گاڑھے پن کو شہر کی دُھول پُراسرار انداز میں ڈھانپنے لگتی حتیٰ کہ رنگ کی دہشت رات کا حصہ بن جاتی۔ تارے نکل آتے، شہر میں بتیاں جلنے لگتیں اور نیچے سڑک پر فلیش پریڈ شروع ہو جاتی مگر کسی کو توفیق نہ ہوتی کہ وہ اس منظر کو ــــ رنگوں کے اس سحر کو پل بھر دیکھنے کے لئے سامنے شمال مغرب کی جانب نگاہ اٹھاتا۔ اس روز بھی غروب کے وقت کالے لہو جیسی رنگت نے زمین کے پاؤں تھام کر آسمان کی جانب اٹھنا شروع کیا تھا۔

کھڑکی کھلی تھی۔

ہم میں سے کسی ایک نے اچانک بے دھیانی میں یا انگڑائی لینے کے بہانے اپنے جسم کو کرسی سے اوپر اٹھایا اور کھڑے ہو کر سامنے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

کھڑکی سے باہر رنگ بدلتے آسمان کی ہیئت کو جس لمحے ہم میں سے کسی آنکھ نے دیکھا وہ لمحہ منجمد ہو گیا۔ اس کی اٹھی نگاہیں باہر پھیلی چھتوں سے اوپر دور تک سفر کرتی پہاڑیوں کی اوٹ میں غروب ہو گئیں ——— واپس نہ آئیں ——— رنگوں کی اسیر ہو گئیں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی گردن موڑے، شانوں کو خم دے اور پیچھے ہٹ کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ جائے مگر ایسا نہ ہو سکا کہ لمحہ اس کے بدن میں منجمد ہو چکا تھا۔ اس وقت شام دبے پاؤں دن کا زینہ اتر رہی تھی۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا شور پھیلا ہوا تھا۔ نوخیز لڑکیوں ناآسودہ جوانوں اور بنجر بوڑھوں کے ریوڑ خوشبو بھری شام میں دلوں کو سیراب کرنے کی خاطر منڈلا رہے تھے اور گھروں کی چھتوں پر تنہائی کی دھول جم رہی تھی۔

کھلی کھڑکی سے زمین اور آسمان کا فاصلہ کم نظر آنے لگا تھا۔ اس کم نظر فاصلے میں ہماری نیوز ڈیسک کھڑکی کے عین نیچے اس گھر کی چھت تھی جہاں شام کو وہ بلا ناغہ نظر آتی چھت کا ایک چکر لگاتی اور پھر منڈھیر پر کہنیاں ٹکا کر نیچے گلی میں دیکھنے لگتی۔ ہم اس معمول کے عادی ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی ہمیں یوں لگتا کہ جیسے وہ اس شام کا ماخذ ہے جو اس وقت شہر پہ اترتی ہے۔ اندھیرا اس کے سیاہ بالوں اور گہری آنکھوں سے نکل کر دن کے روشن پہلو کی تسخیر کرتا ہے مگر وہ پُر دہشت رنگ اس کے نہ تھے جو اس روز آسمان پر طلوع ہوئے۔ اس شام وہ چھت پر نہیں آئی تھی۔

منڈھیر جو اس کی نرم کہنیوں کی عادی تھی اور گلی اس کی آنکھوں کی منتظر، حالت گریہ میں تھی، یہ گریہ ہم میں سے کسی ایک کا مقدر بن گیا کہ اس نے کھڑے ہو کر سامنے دیکھا اور وہ منظر نظر آیا۔

اگر کھڑکی بند ہوتی تو وہ منظر کبھی نظر نہ آتا۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ پرندے جو کہ رات اپنے گھونسلوں میں گزارتے ہیں واپسی میں

دیر کریں۔ جونہی سورج زمین کے کناروں پہ جھکنے لگتا پرندے اپنے آلنوں کا رُخ کرتے ہیں اس وقت آسمان ان گنت پرندوں کا فریم بنا ہوتا ہے جس میں وہ اپنی پرواز کی کمپوزیشن بنا رہے ہوتے ہیں۔ چیل اپنی اونچی اڑان چھوڑ کر نیچے آنے لگتی ہے، کوّے اپنے اجتماع میں اٹھکیلیاں کرتے واپس اپنے پوشیدہ گھونسلوں کو پلٹتے ہیں۔ شارقیں، چڑیاں اور وہ سارے پرندے جو دانے کی تلاش میں یا پرواز کی آرزو میں سویرے اپنے گھونسلوں سے نکل گئے ہوتے۔ واپس ہونے لگتے یوں لگتا کہ جیسے رات ویلے ان کی پرواز ممنوع ہو۔

مگر اس دن ذرا دیر ہو گئی۔ سورج اپنے وقت سے ذرا سا قبل ہی زمین کے کنارے جا لگا۔ پہلے تو اُجلی دھوپ تھی، گرم ہوا تھی۔ پھر اچانک حبس پھیلنے لگا اور زمین سے اٹھتی گرد نے فضا کو ڈھانپ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام شب کے شکم سے نکل آئی۔ منظر بدلا، بے قرار پرندوں نے زمین کی دُھول، لہو رنگ افق اور شام کے سایوں کے بیچوں بیچ رستہ بنایا اور واپس ہوئے مگر دیر ہو چکی تھی۔

اگر کھڑکی بند ہوتی تو وہ منظر کبھی نظر نہ آتا۔

ہم میں سے کوئی اس وقت باہر دیکھ رہا تھا۔

اُس نے دیکھا کہ کالے لہو جیسی فضا میں تیرتے پرندوں کی پرواز میں نقاہت آنے لگی ہے۔ ان کے ہلتے پَر دھیرے دھیرے بند ہونے لگے ہیں۔

اُس نے دیکھا کہ اَن گنت پرندے جو اپنے گھونسلوں کی آرزو میں دُور دراز کے کھیتوں ندیوں اور ٹیلوں کو عبور کر آئے تھے، شہر کے اوپر پھیلی ہوئی دھول اور شمال مغرب کی جانب زمین کے کناروں کے پاس پھیلے لہو رنگ آسمان کے درمیان آپس میں ٹکرا ٹکرا کر گرنے لگے ہیں۔

اُس نے فضا میں پھیلی پرندوں کی چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا۔ کراہوں اور آہوں کا اتنا انبوہ پہلی مرتبہ اس کے تجربے کا حصہ بنا تھا مگر اس وقت نیچے بازاروں میں فیشن پریڈ ہو رہی تھی، خریداری کا پُرشور جوبن تھا اور دفتر میں ٹیلی پرنٹر کی آواز پنکھوں کی گھوں گھوں

اور لوگوں کی گفتگو کے درمیان پرندوں کے واویلے دب کر رہ گئے۔

اُس نے گرتے پرندوں اور کراہتی فضا کے بارے میں کچھ کہنا چاہا، خبر بنانی چاہی لیکن اُس کا قلم انگلیوں میں جم گیا، آواز حلق میں سُوکھ گئی۔

ہم میں سے کسی نے اچانک کہا۔

"گورنمنٹ نے سُود اور بردہ فروشی کے مکمل خاتمہ کا . . . ."

"بیس ہزار۔ لبنان میں مارے گئے ہیں نیپام استعمال ہو رہا ہے۔ لیڈ بنتی ہے"۔

خبریں بنتی رہیں۔

اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر، اوپر جہاں پرندوں کا قتل عام ہو رہا تھا، بے کراں پھیلے منجمد لمحے کی اسیر تھیں۔ پرندے گرتے رہے، نیچے ٹرک پر مکانوں، دکانوں، گاڑیوں کی چھتوں پر آمنے سامنے، چوراہوں پہ، چار چفیرے مُردہ پرندوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

ہم میں سے کسی نے اچانک زور سے گھنٹی بجائی، چائے والے کو بلایا۔ وقت گزرتا رہا مگر وہ لمحہ جو اس کی نگاہوں کے توسط سے کھڑکی سے باہر پھیلے منظر کا حصہ بنا ہوا تھا۔ ایک جگہ ٹھہرا رہا۔

"آج چائے نہیں ملے گی"۔

"کیوں۔ کیوں . . . ." ہم سب بولے۔

"نیچے ہوٹل بند ہے"۔

"اُسی لئے ریکارڈنگ بھی نہیں ہو رہی"۔

"کیوں ـــــ ہوا کیا ہے"؟؟

"یہ جو ساتھ والا گھر ہے ناں"۔

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ ہاں ـــــ"

"یہاں چھت پہ جو لڑکی آیا کرتی تھی ناں"۔

"وہی جو منڈھیر پر کہنیاں ٹکا کر"۔

"ہاں ــــ جی ــــــ"

"کیا ہوا اسے ؟؟"

"اُس نے چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی ـــــــــــ"

"کک ــــ کیوں ــــ کیوں ، کیسے ؟؟"

"اس کا عاشق نیچے ہوٹل پر بیٹھتا تھا۔ ناں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہوگا۔ اخبار والوں سے کیا چھپا ہوتا ہے"۔

"ہوا کیا ؟؟؟؟"

"بس جی کیا بتائیں۔ عشق کا معاملہ ہے ، دونوں طرف کے بڑے نہیں مانتے تھے۔ لڑکی کے بھائیوں نے عاشق کو غائب کروا دیا۔ بس جی۔ اس پر لڑکی نے موت کو گلے ـــــ"

"اچھا ـــــ اچھا ــــ ٹھیک ہے ــــ کہیں اور سے چلتے لا۔ ذرا جلدی سے"۔

"کرائم کی کیا پوزیشن ہے ؟؟"

ہم اچانک ہی سارے بولنے لگے اور پھر یک دم خاموش ہو گئے۔

ٹیلی پرنٹر کی آواز پنکھوں کی گھوں گھوں ، پنسلوں کی سرسراہٹ ، کاغذوں کی پھڑپھڑاہٹ اور ریڈیو کا شور نیوز ڈیسک کے گرد فصیل بنائے کھڑا تھا۔

اس فصیل کے درمیان کھڑا چپ چاپ ابھی تک وہ باہر دیکھے جا رہا تھا۔

گرتے پرندوں کو ، رنگ بدلتے آسمان کو دیکھنے کے لئے نیچے سڑک پر ، شہر میں کسی کو توفیق نہ تھا۔

اچانک ہم سے کوئی ایک بولا۔

"کھڑکی بند کر دو"۔

اس نے پلٹ کر دیکھا تو منجمد لمحہ پگھل گیا۔ گہری سانس لے کر اس نے ہم سب کو نگاہوں کے حصار میں لیا اور سرگوشیوں میں بولا۔

"جب اس کے محبوب کو صفحہ ہستی سے غائب کیا جا رہا تھا۔ جب پرندے گر رہے تھے

جب نیپام پھینکا جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھت پر آئی، اس نے مرتے پرندوں، جھلستے لوگوں اور اپنے محبوب کے لئے دعا کی اور اس بے رحم منظر کے لئے ــــــ اور ــــــ اور ..... ؟؟

پھر آہستہ سے منڈھیر پہ چڑھ کر نیچے کود گئی۔ اُس کی موت آج کی لیڈ بنتی ہے۔"

اُس کی سرگوشی ہم نہ سن سکے، اس نے اپنی نحیف آواز کو اپنے تک رکھا، اپنی کرسی پہ بیٹھ کر اس نے سر میز سے ٹکایا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس رات ہم میں سے کوئی ایک یا ہم سب چھپ چھپ کر روتے رہے۔

اور کھڑکی ــــ ؟

کھڑکی پھر کبھی نہ کھلی۔

ـــــ

قصّہ گو

یہ اس کے قدموں کی چاپ ہے
پراسرار سی چاپ، ٹھہر ٹھہر کے چلنے کا انداز، اپنا آپ منوانے
کی خواہش میں شرابور، بدن جس میں مرد اور عورت کی خوبیاں
خامیاں یکجا ہو گئی ہیں۔
یہ اس کے بدن کی خوشبو ہے جس کے جلو میں ان گنت اسرار
چھُپے ہیں۔
یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

"چوک کے ساتھ بنی ریلنگ پہ میں صرف تھوڑی دیر کے لیے آ بیٹھا تھا اس وقت سڑک خالی تھی۔ آخری شو کا آخری تماشائی بھی جا چکا تھا۔ صرف ایک تانگہ سینما کے گیٹ کے پاس کھڑا تھا جس کا کوچوان پچھلی گدی پہ نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ طویل شور شرابے کے بعد اچانک چھا جانے والا سناٹا بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے آوازوں کو وقتی طور پر گلا دبا کر خاموش کیا گیا ہو۔ اس پُراسرار سی خاموشی میں اچانک نہ جانے وہ کہاں سے

آگیا چور چال چلتا ہوا کہیں سے نکل کر ریلنگ کے پاس آکھڑا ہوا اور مجھے تکنے لگا۔ پیاسی بے چین کر دینے والی نگاہیں۔ اس کی جلتی بجھتی آنکھوں سے بلبلے بلبلے ہاتھ نکل کر میرے بدن کا مساج کرنے لگے۔"

"میں نے کسمسا کر ریلنگ چھوڑی اور پیدل چلنے لگا فٹ پاتھ پر پہنچ کر جب موڑ مڑنے لگا تو پلٹ کر دیکھا وہ میرے تعاقب میں تھا۔ اس نے سبز رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں گلے میں نقلی موتیوں اور رولڈ گولڈ کا ہار اور بالوں میں سبز پراندہ جس کا پھمن پشت پر لہرا رہا تھا۔ ایک پل کے لیے اس نے ہاتھ اٹھا کر بازو کھول کر انگڑائی لی، اور رفتار تیز کر دی۔ میں جلدی سے سڑک پار کر کے گلی میں داخل ہو گیا۔ گھر قریب آگیا تھا بس کیا بتاؤں عجیب رات تھی سن رہے ہو یا سو گئے ہو؟"

میں نے آنکھیں کھول کر ماتھے پہ بل ڈال کر حیرت کا اظہار کیا اور یوں اسے میرے ہمہ تن گوش ہونے کا یقین آگیا۔

"گلی گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف ان کمروں یا نیم چھتوں سے روشنی جھانک رہی تھی جہاں کچھ ہو رہا تھا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں عجیب سی رات تھی۔ میں نے بھی غلطی کی جو اتنی دیر گئے گھر سے نکل آیا۔ یہ سگریٹ کی طلب بھی ذلیل شے ہے۔ آدھی رات کو طلب ہوئی ڈبیہ خالی تھی میں اٹھ کر باہر نکل آیا، چوک تک آگیا بازار بند ہو چکا تھا۔ صرف ایک منٹ کے لیے ریلنگ پہ بیٹھا اور اسے اپنے پیچھے لگا لیا۔ سارا رستہ وہ عجیب عجیب اشارے کرتا رہا۔ جب میں گھر کے پاس پہنچا تو جلدی سے کھلے دروازے کی آڑ میں جا کر مڑ کر دیکھا وہ ہنس رہا تھا۔ میں نے ڈر کے مارے زور سے کنڈی لگائی اور بھاگ کر اوپر کی منزل پہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرے خیال میں ایک بج چکا تھا۔ اب کیا وقت ہو گا۔؟"

میں نے گھڑی پہ نگاہ دوڑائی تو سوئیاں اس کے بیان کردہ وقت کی تصدیق کر رہی تھیں۔

"بس یہی ٹائم تھا۔ اب تمہیں کیا بتاؤں، یہ تجسس بھی تمباکو کی طلب جیسا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا ذرا دیکھوں کہیں باہر تو نہیں کھڑا۔ خواہ مخواہ کھڑکی کھول کر گلی میں جھانکنے کی خواہش اٹھی اور جب میں نے نیچے جھانکا تو یقین کرنا اسے باہر گلی میں آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے وحشت بھری پیاسی آنکھوں کے ساتھ اسے اپنی جانب گھورتے پایا اس نے مجھے ٹوہ لیتے دیکھ لیا تھا اور جونہی میری نظر اس پہ پڑی۔ جانتے ہو اس نے کیا کیا؟"

میری آنکھیں جاننے کی خواہش میں کھلی تھیں۔

"اس نے آسماں کی طرف پھیلے بازوؤں کو دائرے کی صورت میں حرکت دی۔ پاؤں زمین سے اٹھا کر ہلکے سے واپس زمین پہ مارا چھن کی آواز ابھری اور دھمال شروع ہو گیا پہلے تو میں اسے اپنی آنکھوں کا وہم سمجھتا رہا، لیکن جب اس کے دھمال کی ہلکی متوازن آواز گلی میں اُبھری تو کھڑکیاں دروازے کھلنے لگے آمنے سامنے کے مکیں دائیں طرف کے پڑوسی اور بائیں طرف کے کارخانے کے مزدور جو ساری رات اوور ٹائم لگاتے ہیں، آہستہ آہستہ ان چور جگہوں پر جمع ہونے لگے جہاں سے وہ اسے ناچتے دیکھ سکتے تھے میں کھڑکی بند کرنا بھول گیا۔ حیران گم سم اسے تکتا رہا ناچتے ناچتے اس نے سینکڑوں چکر لگائے مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ دھمال کی گردش میں اس کے تن کی لیریں جل گئیں یا کسی نے انہیں احتیاط سے الگ کر لیا تھا اب تو وہ الف ہو چکا تھا اور جب ناچتے ناچتے نڈھال ہو کر وہ اپنے کپڑوں پہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تو مکینوں نے اس کے برہنہ بدن کا راز پا کر چیخیں ماریں اور کنڈیاں چڑھا کر دبک گئے خوف کے مارے میری زبان سوکھ گئی۔ بڑی مشکل سے کھڑکی کا سہارا چھوڑ کر واپس مڑا اور مسہری پہ گر کر ہانپنے لگا ابھی میرے تالو تلے رطوبت ابھری ہی تھی کہ میں نے اپنے جسم پہ کسی نرم گداز چیز کی حرکت محسوس کی میرے چہرے کے مختلف حصے گریبان، سینہ، پنڈلیاں کوئی ننھی سی شے نرمی کے ساتھ میرے بدن کا طواف کر رہی تھی۔ میں نے اسے وہم جانا اور کروٹ بدل لی۔ اب میری پشت پہ سُرور کی ہلکی سی لہر اُٹھی میں نے کھڑکی

کی راہ سے آتی ہوا کو اس کا سبب جانا اور اٹھ کر بیٹھ گیا اپنی طرف سے بہت ہمت کی کہ چلو اس بہانے نیچے جھانک لوں گا اور کھڑکی بھی بند کروں گا مگر تم جانتے ہو۔ میں نے کیا دیکھا۔ ؟؟"

میری آنکھیں جاننے کی خواہش میں کھلی تھیں۔

"اس کا چہرہ اور۔ اور... ہونٹوں سے جھانکتی زبان،... کھڑکی سے لگا چہرہ جس سے نکل کر زبان لمبی زبان اب تک میرا بدن چاٹ رہی تھی اور میں میں..... میں جس کو بھی بتاتا ہوں وہ نہیں مانتا۔ میں جب لوگوں کو بتاتا کہ بیک وقت مرد اور عورت کی خوشبو اس کے پاس سے آرہی تھی وہ مذاق کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے بھی اسے دھمال ڈالتے دیکھا۔ لوگ بہت جھوٹے ہیں وہ اپنے سامنے سب کچھ دیکھتے ہیں مگر گواہی نہیں دیتے۔ تصدیق نہیں کرتے۔ ایمان نہیں لاتے۔ اب میں کیا کروں۔ جب تک کوئی میری بات کی تصدیق نہیں کرے گا، ایمان نہیں لائے گا، یقین نہیں کرے گا۔ میں کیسے اپنے ہونے کا دعویٰ کروں گا۔ تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ اچھا چلو اگر تم نے نہیں دیکھا میں تو تمہیں یہ سب کچھ کر کے دکھاتا ہوں۔ تمہیں سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے تو اٹھو اس رات جو سفر میں نے کیا تھا کرو۔ ہاں اس طرح۔ اب دیکھو۔ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ سنو۔ اور دیکھو۔ یقین کرو۔ ایمان لاؤ۔"

میں اس کی طویل خود کلامی سے تنگ آگیا۔ پچھلے نہ کئی دنوں سے روز رات ہوتے ہی وہ یہ قصہ شروع کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اس سے قبل بھی وہ یہ بیان کر چکا ہے ہر بار اپنی واردات ختم کرنے کے بعد وہ ہاتھ اٹھا کر بازو کھول کر انگڑائی لیتا ہے اور دھمال ڈالنے لگتا ہے۔

عروج کا زوال، کا عروج

من پسند موسم تھا اور دل کو لگتی باتیں۔

نیلے آسمان کے طشت تلے چمکتی دھوپ میں اڑتے پرندوں، صحن میں موسمی پودوں پہ یلغار کرتی بہار کو دیکھتے، باغ میں ڈالی ڈالی پات پات میں بہتی خوشبو کو سونگھتے اور آہنی گیٹ کے باہر سڑک پر شور مچاتی زندگی کے جوبن کو کنکھیوں سے تکتے، باتیں کرتے انہیں کتنی دیر ہوگئی معلوم نہیں۔

"تمہارا چھوٹو کتنے دن کا ہوگیا ہے۔"

"دن — ؟ دن تو اس نے ایک ہی جست میں سارے پھلانگ دیئے تھے سال تو سال سے اوپر کا ہونے والا ہے۔"

"چلتا ہے"

تھوڑا تھوڑا سا۔ کوشش کرتا ہے اپنے پاؤں زمین پہ جمانے کی۔ لڑکھڑا جاتا ہے نشئی کہیں کا۔ تمہاری گڑیا تو اب تمہیں پہچانتی ہوگی — ؟"

"بڑی اچھی طرح۔ میرے آنے کا وقت اسے پتہ ہے۔ جب میں گھر آتا ہوں تو ہاتھ ہلا ہلا کر شور مچاتی ہے۔ میرا چہرہ اس کے لیے صرف میرا چہرہ ہے۔"

"کیسے میں سمجھا نہیں۔"

"وہ میرے علاوہ کسی اور کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک نہیں آتی۔ یار، ان بچوں کی یادداشت خوب ہوتی ہے۔"

یار تم یادداشت کی بات کرتے ہو۔ میں نے ایک دفعہ اپنے چھوٹو کے منہ سے دودھ کی بوتل نکال کر اپنا انگوٹھا دے دیا۔ مجال ہے جو اس نے چوسا ہو، ذائقہ تک یاد رکھتے ہیں یہ۔"

"دانت نکلے کہ نہیں ؟"

"ایک دانت اوپر کا اور — ایک نیچے کا سوئی سے ذرا موٹا۔ تمہاری گڑیا کے دانت تو۔ ؟

"سنا ہے کہ بچیوں کے دانت جلد نکل آتے ہیں۔ اس کی ماں شکایت کرتی ہے چھاتی کاٹنے کی۔"

"تم تو نہیں کاٹتے تمہارا کیا پتہ ہے۔"

"مذاق نہیں کر رہا۔ میرا خیال ہے اب دودھ چھڑا دینا چاہیئے۔ تم کون سا دودھ استعمال کرتے ہو۔ ؟"

"وہ جو میری ماں نے مجھے پلایا تھا۔"

"واقعی یار، ماں کے دودھ میں بڑی تاثیر ہوتی ہے سنا ہے۔ چالیس سال تک ہڈی قائم رکھتا ہے۔"

"تم تو ابھی چالیس سال کے نہیں ہوئے۔"

"میں جس دن باپ بنا اس دن کے بعد عمر کا خیال چھوڑ دیا مجھے تو یوں لگا کہ اب جیسے میری بقیہ عمر کوئی اور گذارے گا۔ میں بہت محتاط ہو گیا ہوں۔ یہ اولاد بھی عجیب چیز ہے۔"

"تم احتیاط کی بات کرتے ہو۔ میں تمہیں کمال کی بات بتاؤں میں اپنے چھوٹو کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ گھوڑا بن کر اس کو پشت پر سوار کر رکھا تھا۔ مگر وہ ہر بار لڑھک جاتا۔ پھر میں نے اسے کندھے پر بٹھا لیا۔ کبوتر کی طرح، اچانک ایک چیل ممٹی سے نیچے کی جانب آتی نظر آئی۔ تیر کی طرح فضا کو چیرتی میرے ماتھے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ میں ڈر گیا کہ جیسے مجھ سے اسے چھین کر لے جائے گی۔ بوٹی کی طرح ۔ میں ڈر گیا اور اسے کندھے

سے اُتار کر گود میں دبا کر کمرے میں بھاگ گیا۔ لل۔ لیکن وہ چیل ساری رات میرے خوابوں میں آتی رہی۔"

"بڑے بزدل ہو اپنے بچے کو بھی ڈرپوک بناؤ گے۔"

"عورتوں والے طعنے مت دو۔ ذرا سوچ کر بتاؤ۔ جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں یا جو ہمارے ساتھ بیتی ہے ایسا ہماری اولاد کے ساتھ بیتے تو تم سہہ لوگے ذرا سوچ کر بتانا۔"

"بات تو تیری ٹھیک ہے لیکن بچوں کو ان کی اپنی زندگی گذارنے دینی چاہیئے۔"

"لیکن یار وہ خوفزدہ کر دیتے ہیں۔ ان کی بیماریاں۔ ان کی ضرورت سے زیادہ ہنسی، صحت مند چہرے، چمکتی آنکھیں، یا پھر۔ ان کے چھوٹے موٹے زخم یا ان کا اچانک غائب ہو جانا، گھر کے اندر ہی کہیں گم ہو جانا۔ ڈرا دیتا ہے تم اپنی گڑیا کے بارے میں سوچ کر پریشان نہیں ہوتے۔؟"

"پریشانی تو ہوتی ہے۔ جو وقت ہم نے گذارہ ہے اگر ایسا اُن کے ساتھ گذرا تو؟"

"لیکن یار ہر آدمی اپنا وقت خود ساتھ لے کر آتا ہے۔ اندر سے ماں کی کوکھ سے۔ ہم دوسروں کے اوقات کیسے مقرر کر سکتے ہیں بس احتیاط کر سکتے ہیں۔ جس طرح احتیاطاً میں نے ابھی سے گڑیا کی خاطر پیسے جوڑنے شروع کر دیئے ہیں۔"

"یہ کام تو تمہاری بیوی کرتی ہوگی۔ تم سے چھپا کے۔"

"لیکن ہم دونوں کے مقاصد اور اسباب جدا جدا ہیں۔"

"کیسے میں سمجھا نہیں۔"

"وہ مستقبل کی امیدوں کے حوالے سے ذخیرہ بناتی ہے، میں آنے والے وقت کے خوف سے بوند بوند اکٹھی کرتا ہوں۔"

"آنے والے وقت کا کیا پتہ ؟"

"پتہ تو ایک پل کا بھی نہیں۔ لل۔ لیکن یہ بچے خواہ مخواہ آنے والے زمانہ کا

احساس کرانے لگتے ہیں :۔

"تم نے سوچا کیا ہے ۔؟

"کس بات کا ۔ ؟ "

اپنی گڑیا کا ۔ میں تو اپنے چھوٹو کو تھوڑے عرصہ بعد نرسری میں داخل کرادوں

گا اور تھوڑا بڑا ہونے کے بعد کسی دوسرے شہر، دراصل میں اسے آزاد ہو کی طرح

پروان چڑھنے کا موقع دینا چاہتا ہوں :۔

" غلام قوموں میں ہم میرا مطلب ہے غلام لوگوں میں آزاد مرد پیدا نہیں ہوتے ۔"

"فضول باتیں نہ کرو ۔ میں نے جو سوچا ہے ایسا ہی کروں گا ۔ میری خواہش ہے

کہ چھوٹا اپنی زندگی کے فیصلے خود کرے اپنے ارادے اور آرزو کے مطابق :۔"

" بہت دور کی بات سوچ رہے ہو ۔ سچ پوچھو تو میں اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ

پاتا ۔ میں نے تو اپنی گڑیا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے :"

"کیوں ۔ کیوں خیر تو ہے ۔ ؟"

" دودھ پھینک دیتی ہے ۔ جلاب نہیں رک رہے :"

"دانت نکل رہے ہوں گے گھبرانے کی کیا بات ہے :"

"کمزوری بہت ہو گئی ہے آج تو بالکل چھوٹا سا چہرہ نکل آیا ہے ۔ آتنا سا "

" ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤ بلکہ کسی چائلڈ سپیشلسٹ کے پاس لے جاؤ ۔ بچوں کے معاملے

بڑے نازک ہوتے ہیں ۔ میرا اپنا چھوٹو بھی کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ۔ اچھی طرح کھڑا

نہیں ہوتا ٹانگوں میں کمزوری ہے غالباً :"

"کیلشیم کی کمی ہو گی :"

پتہ نہیں کس کس چیز کی کمی ہے ۔ خود ہم میں سجانے کتنی چیزوں کی کمی ہو گی

لل ۔ لیکن یہ کیا ہم بچوں کی باتیں لے بیٹھے ہیں ۔ کوئی اور بات کرو ۔"

کوئی اور بات ۔ ؟ ۔

"ہاں، کوئی اور بات۔"

من پسند موسم کو گزرے زمانے بیت گئے اور دل کو لگتی باتیں گزرے دنوں کی دھول میں گم ہو گئیں۔ نیلا آسماں کا طشت گرد سے بھر گیا۔ صحن میں موسمی پودوں کے پتے اور پھول سوکھ کر کھاد بننے لگے۔ باغ میں ڈالی ڈالی پات پات پر خزاں کی اداسی پھیل گئی اور آہنی گیٹ کے باہر سڑک پر سسکیاں لیتی زندگی رینگ رینگ کر ان کی آنکھوں کے سامنے گزر رہی تھیں۔

"تم آئے نہیں اتنے دن خیر تو تھی۔"

"خیر کی عمر تو گزر گئی اب آنا نہ آنا برابر ہے۔"

"میں سوچتا رہتا ہوں تمہارے بارے میں۔ خود آ نہیں سکتا کمزور بہت ہو گیا ہوں نا۔"

"اپنی گڑیا کو کہا ہوتا چھوڑ آتی میرے ہاں۔"

"اسے فرصت نہیں شوہر، بچے۔ گھر کی ذمہ داریاں۔ لیکن تم تو آ سکتے ہو۔"

"تم، میں کیسے آتا۔ سڑکوں پہ اتنا رش ہے۔ باہر نکلو تو کچلے جاؤ مجھے تو اکیلا نکلتے خوف آتا ہے۔

"اپنے چھوٹو کو کہا ہوتا میرے ہاں لے آتا۔"

"اپنا چھوٹو۔ چھچھ، چھوٹو بڑا ہو گیا ہے، پرایا ہو گیا ہے۔"

تمہارا کہنا تو مانتا ہو گا۔؟

"بہت فرمانبردار ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے۔ ذرا بھی حرکت نہیں کرنے دیتا کہتا ہے اب آرام کی عمر ہے بڑی نصیحتیں کرتا ہے کہتا ہے۔ زیادہ مت چلئے۔ نرم غذا کھائیے، نئے دانت لگوائیے۔ یہ بچے جوان ہو کر ہمارے سرپرست بن جاتے ہیں۔"

"بالکل، بالکل میری گڑیا کی طرح، وہ بھی میرا بڑا خیال رکھتی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔"

"میں کئی دن سے سوچ رہا تھا تمہارے پاس آنے کا۔ بہت خواہش تھی۔ ملنے کی نہ۔ پر وسیلہ نہ تھا تم تک آنے کا۔"

"میرا بھی یہی حال ہے آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ چھوٹو اپنی فیملی کے ساتھ پکنک پہ گیا ہوا ہے۔ چھٹی کا دن ہے نا۔ سڑکیں بھی خالی خالی سی ہیں۔ میں نے سوچا ہمت کروں۔ تم سے مل آؤں زندگی کا کیا پتہ۔ راستے میں کئی دفعہ تھک کر بیٹھ گیا۔ وہ جو ہسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر سیمنٹ کا بینچ ہے نا وہاں بیٹھا رہا۔ پھر تمہارے پچھواڑے جو موڑ ہے وہاں رک گیا۔ بوہڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ بڑا سرور آیا۔ میں نے سوچا جب تمہارے ہاں پہنچوں تو تازہ دم نظر آؤں۔"

"ٹانگوں کا کیا حال ہے۔"

"نقاہت ہو جاتی ہے۔ ہڈیوں میں کیلشیم نہیں رہی نا۔ لڑکھڑانے لگتا ہوں، جیسے کوئی نشئی ہوتا ہے۔"

"چلے بھی تو بہت ہو۔"

"ہاں بہت چلا ہوں۔ تمہارے دانتوں کا کیا حال ہے۔"

"تیسری دفعہ نیا سیٹ لگوایا ہے۔ دانت نقلی ہوں تو ذائقہ بھی مصنوعی لگتا ہے اور اب تو دلیہ بھی حلق سے نہیں اترتا۔"

"شکر خدا کا آنکھیں ٹھیک ہیں۔"

"ہاں۔ لیکن من پسند چیزیں نظر نہ آئیں تو آنکھوں کا کیا فائدہ ؟"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب دیکھنے کو کیا بچا ہے۔"

"دیکھنے کو تو بہت کچھ ہے دیکھنے کی تاب نہیں۔"

"تاب یا عمر۔"

"ایک ہی بات ہے حوصلہ ڈھے جائے تو عمر ختم ہو جاتی ہے تمہیں یاد ہے۔ وہ وقت جب سارا سارا دن دریا کے کنارے دوڑتے، پانی سے لڑتے۔ تیرتے اور مچھلیاں پکڑ کر گذارتے تھے اور راتوں کو جنگل میں درندوں کی آوازیں نکال کر درندوں کو ڈراتے تھے خیر وہ تو جوانی کا آغاز تھا بعد میں جب ہم ذرا سیانے ہو گئے تو کیسے کیسے طوفانوں کو کلاوے میں بھر کر موڑ دیا۔ یاد ہے ناں۔ جب تمہارا چھوٹو اور میری گڑیا دنیا میں آئے تھے تو ہم نے کیسے اچھے اچھے موسم ان کو لا کر دیئے۔ اپنی ساری زندگی ان کے نام لگا دی۔"

"یار۔ آدمی۔ اس طرح کیوں کرتا ہے۔؟"

"زندہ رہنے کے لیے آدمی اپنی زندگی دوسروں کو دے دیتا ہے۔"

"سچ۔"

"ہاں۔ اب دیکھو ناں۔ ہم رخصتی کے موڑ پر کھڑے ہیں۔ لیکن تمہارا چھوٹو اور میری گڑیا وہاں سے آغاز کر رہے ہیں جہاں ہم نے سفر چھوڑا تھا اب ہم ان میں سانس لے رہے ہیں۔"

"سانس ہونہہ۔ یہ سانس نہیں ہچکیاں ہیں میرا تو دم گھٹ رہا ہے تم خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتے ہو روگ چھپانے کے لیے۔"

"روگ۔ میں سمجھا نہیں۔؟"

"روگ ہی تو ہے۔ رخصتی کے موڑ پر جو سناٹا ہے۔ لاچاری ہے، ذائقوں سے خالی زبان، بے جان ٹانگیں۔ بے ارادہ بدن۔ کوئی ہے جو وسیلہ بنے تم تک پہنچنے کا۔ یا تمہیں مجھ تک پہنچانے کا۔"

"یار اتنی کھردری باتیں مت کرو۔ رخصتی کا موڑ ہے ذرا مسکرا کر۔"

"ہوں مسکرا کر۔ مسکراہٹ جوان تو مند چہروں پر سجتی ہے ہمارا تو منہ بگڑ جاتا ہے

ہنستے وقت، جھریوں سے۔"

"تیری تو عادت ہے ایسی باتیں کرنے کی۔ بے کار پریشان رہتے ہو۔"

"اور تم بے کار کی خوش فہمی میں رہتے ہو۔"

"خوش فہمی کی بات نہیں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"یہ خوش فہمی نہیں کہ تم دوسروں میں زندہ ہو۔ ہونہہ۔ ساری زندگی اپنا کلبوت خالی لے کر پھرتے رہے ہو اب اپنے کلبوت میں کون آنے دے گا۔"

"بہت کھردرے ہو۔ زہریلے کہیں گے۔ کوئی اور بات کرو۔"

"اب کہتے ہو اور بات کروں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ یہاں کوئی آدمی بھی اپنی زندگی خود نہیں گزار رہا۔ لوگ ایک دوسرے کی زندگیاں ادھار لے کر اجاڑ دیتے ہیں اور تو اور ہمارے بچے اس کا آغاز کرتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

"یہی تو اطمینان کی بات ہے۔"

"اطمینان کی موت۔"

"اچھا اب چلو مجھے چھوڑ آؤ۔"

"مم۔ میں چھوڑ آؤں کیسے۔؟"

"اتنا بھی نہیں کرو گے میری خاطر۔ اتنی دور سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ اب اکیلا واپس جاؤں واہ اچھی سنگت ہے۔"

"اچھا اچھا۔ میں چھوڑ آتا ہوں تیرے ساتھ گپ شپ رہے گی۔ آہستہ آہستہ چلیں گے چھوارے جو موڑ ہے ناں وہاں لوہٹر کے درخت تلے ذرا ٹھہریں گے اور پھر ہسپتال کے پاس فٹ پاتھ پہ سیمنٹ کے بنچ پر آرام کریں گے۔ آہستہ آہستہ چلیں گے۔ گپ شپ کرتے ہوئے کیوں ٹھیک ہے ناں۔

"بالکل تو پھر اٹھو دیر ہو رہی ہے۔"

"ہاں لیکن ایک بات بتاؤ۔"

"کیا۔؟"

مجھے واپس یہاں چھوڑنے کون آئے گا؟"

"تمہیں واپس چھوڑنے۔؟"

"ہاں۔ میں تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔ تمہیں چھوڑنے۔ لیکن مجھے چھوڑنے کون آئے گا۔"

"تمہیں چھوڑنے۔ تمہارے ساتھ میں آؤں گا میں۔"

"اور پھر تمہیں چھوڑنے کون جائے گا۔؟"

"تم۔ تم آؤ گے اور پھر میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ اب اٹھو نا رخصتی کے سفر پر ہم ایک دوسرے کا زادِ راہ ہیں آدمی نے اپنا سفر اپنے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ آدمی اپنا زادِ راہ خود ہے اچھا اب اٹھو بھی۔ ہاں۔ اس طرح شاباش۔ اٹھو۔ ہمت کرو۔ ہاں اسی طرح۔"

کسی کے بولنے، لڑکھڑانے اور ہولے ہولے قدم اٹھانے کی آواز ابھرتی ہے اوپر کی منزل سے ایک جوڑا کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ نیچے صحن میں ایک بوڑھا شخص جس کے لبوں پر باتوں کی تکان، ٹانگوں میں نقاہت اور آنکھوں میں ناگوار مناظر کی دھول ہے، باہر سڑک کی جانب جاتا نظر آتا ہے۔

عورت تشویش بھرے لہجے میں کہتی ہے۔

"وہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور۔ اور اب باہر جا رہے ہیں۔"

مرد آہستہ سے کہتا ہے۔

"کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اپنی زندگی خود گذارنا چاہتے ہیں کیا کروں۔؟"

دونوں مشترکہ ارادے کے ساتھ پلٹ کر، یکساں چال چلتے۔ جھولے میں سوئے۔ بچوں کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حمزہ کی کہانی

ایک روز اچانک حمزہ کو دیوار کی پرلی طرف کا منظر نظر آ گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا کہ نہ تو اس کی ایسی کوئی خواہش تھی اور نہ طلب۔

یہ شاید اُس لمحے کا اثر تھا جس میں اس نے غروب ہوتے سورج کو دیکھا۔

ڈوب جانے والا سورج اس کے لیے دل اور دیواریں برہنہ کر گیا۔

شام کا وقت تھا، پرندوں کی واپسی ہو چکی تھی۔ نیچے گلی میں مدھم مدھم تاریکی میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ پانی کا نل کھلا ہوا تھا۔ جس سے گرتے پانی کی آواز اُس رنگ بدلتے ماحول میں بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ چھت پر دھوپ میں پھیلائے گئے کپڑے سوکھ چکے تھے اور اب زہرہ انہیں اتار رہی تھی لیکن ایسا کرتے وقت اُس کی نگاہیں بار بار حمزہ کی پشت پہ جا ٹھہرتیں۔ کئی مرتبہ اس نے ہنکار کر بڑبڑا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر حمزہ غروب کی کرن تھامے افق کے پاتال میں اترا ہوا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترتے وقت زہرہ نے ایک مرتبہ پھر اس کو مڑ کر دیکھا اور کپڑوں کا گھٹڑ کلاوے میں بھر کر نیچے چلی گئی۔

حمزہ آشنا لا تعلق، اجنبی اجنبی پہلے تو کبھی نہیں تھا بے پرواہ سا مگر کسی اور خیال میں گم سامنے مسجد کے میناروں کے عقب سے پھوٹتی سرمئی شام اور ریلوے ورکشاپ کی آہنی چھت کی اوٹ میں جاتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

گول سرخ توے کی مانند دھکتا سورج ہولے ہولے لوہے کی سفید مستطیل ہموار چھت پر پھیل پھیل کر غائب ہو رہا تھا۔ دھکتی گولائی آہنی مستطیل چھت کے کناروں سے افق کی پٹی تک پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں سے سیاہ اور گلابی گرد دھیرے دھیرے چار چفیرے سرکتی نظر آ رہی تھی۔ ڈوب جانے والے سورج کے نتیجے میں ایک گھنا سناٹا ابھر آیا۔ گلی میں شور مچاتے بچے گھروں کو چلے گئے۔ کسی نے نل کی ٹونٹی بند کر دی اب ایک بے قرار چپ چھتوں چھت پھیلی شہر کے گرد تنی۔ افق کی رنگ دار پٹی تک جا پہنچی۔ اس بیکراں خاموشی میں اچانک وہ لمحہ جو اس نے غروب کے منظر کے لیے وقف کیا تھا، واپس مڑا۔ اس کے اندر گذرے زمانوں کا شور لیے پلٹا اسے یوں لگا کہ جیسے غروب ہوتا سورج واپس پلٹ کر اس کے وجود کی فضا میں آ چکا ہو اور پھر وہ ہوا جس کی نہ اسے طلب تھی اور نہ خواہش۔ دل اور دیواریں عریاں ہو گئیں۔

نیچے صحن میں کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

وہ جلدی سے مڑا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے زہرہ کے پاس صحن میں جا کھڑا ہوا۔

"شام کو چھت پہ نہیں گھومنا چاہیئے"

اسے زہرہ کی آواز سنائی دی لیکن وہ چپ رہا اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی بات انہی لفظوں میں اسے کہی جائے گی۔ جتنی دیر وہ زہرہ کے سامنے کھڑا اس کے دل میں پیدا ہونے والے سارے خیالات جانتا رہا جوں جوں دل میں پلتے خیالوں کے جرثومے اس تک پہنچتے رہے اس کا اضطراب بڑھتا رہا اور جب وہ جھنجھلا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تو اسے احساس ہوا۔ کہ وہ۔ وہ حمزہ نہیں جو تھوڑی دیر پہلے چھت پر ٹہل رہا تھا۔

یہ پہلی رات تھی جب اس نے دلوں کے بھید پانے شروع کئے

سارے گھر والے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ چھوٹا بھائی کنڈی لگانے کے

بعد اپنی رائٹنگ ٹیبل کے قریب کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ حمزہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور جان گیا کہ وہ وقت گزاری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور منتظر ہے کہ کب رات کا ایک بجے اور چھت پر جاکر پڑوس میں رہنے والی دوشیزہ سے ملاقات کرے۔ حمزہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ساری بات کا پتہ چل گیا۔ اس نے پریشان سا ہو کر زہرہ کی طرف دیکھا جو تکیے پر بازو پھیلائے اس کی منتظر تھی۔

حمزہ نے لیٹتے ہی آنکھ بند کرنا چاہی اور زہرہ کے چہرے کو بصارت کی حدود سے دور دھکیلنا چاہا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ زہرہ نے بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور کچھ کہنے لگی۔ مگر حمزہ نے قطعاً توجہ نہ دی کہ وہ پہلے ہی جان چکا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔

"ابھی بہت دن ہیں۔" حمزہ بولا

"کس بات میں۔؟" زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

حمزہ نے آنکھیں کھول کر اس کے پیٹ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور۔ اور۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ۔"

زہرہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ وہ نہ صرف اپنی کوکھ میں پلنے والے بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی بلکہ اور بھی کئی باتیں اس کے ذہن میں اٹھ رہی تھیں۔ حمزہ نے ان باتوں کی بُو پالی۔ اذیت اور شرمندگی سے اس نے دل میں سوچا۔ دلوں کے بھید پانا کتنا عذاب ہے۔ زہرہ نے اپنے بچے میں محبوب کی تصویر دیکھی ہے اور اب۔ اور اب وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کے بازو پر سر رکھا تو میں۔ میں نہیں۔ رہا۔ وہ بن گیا۔ دلوں کے بھید جاننا کتنا عذاب ہے۔ مگر کیا پتہ یہ میرا وہم ہو۔ یقیناً یقیناً۔ ایسا ہی ہوگا۔ میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں۔"

اُس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ بدلی۔ گہری سانس لے کر ذہن کو خالی کر کے سونا چاہا۔

یہ پہلی صبح تھی جب دلوں کے بھید آشکارا ہوئے۔

ایک انوکھا پُر اسرار، خوفیلا حیران کن دن تھا۔ جب دفتر جاتے وقت مسافر گاڑی میں بیٹھے، لوگ کھلی کتاب کی مانند اس کے سامنے پھیلے تھے۔ وہ حیرت اور خوف سے کانپنے لگا۔

اسے ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر جگہ ملی۔ فرنٹ سیٹ پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں اور ان کے پچھلے والی سیٹوں پہ دفتری لوگ اور صبح کے تازہ دم مسافر جنہیں کام پہ پہنچنے کی جلدی تھی جبکہ اس کے بالکل ساتھ جو شخص بیٹھا تھا اس کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا۔
حمزہ نے سہم کر کندھے سکوڑے اور شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ لیکن یہ باہر جھانکنا اب بیکار تھا اسے ساتھ بیٹھے شخص کے دل کا حال معلوم ہو چکا تھا اس کا جی چاہا کہ سب کو بتا دے کہ اس کے ساتھ جو شخص بند گلے کا کوٹ پہنے بیٹھا ہے جس کے گال پر زخم کا نشان ہے جس نے گولڈن واچ باندھی ہوئی ہے اور جو اپنا بریف کیس قدموں کے پاس رکھے ہوئے ہے اپنے ذہن میں کسی کو قتل کرنے کا منصوبہ نہایت مہارت کے ساتھ ترتیب دے چکا ہے۔

حمزہ نے سہم کر اس کی طرف دیکھا کچھ کہنا چاہا۔ مگر بوکھلا گیا اس کی نگاہ پھسل کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی لڑکیوں کی پشت پہ جا ٹکرائی۔ ان میں ایک مکمل عورت بننے کے مراحل میں تھی۔ حمزہ نے انہیں آئینہ میں دیکھا اور یکدم دبک گیا وہی مخصوص بے چینی جو متوقع قاتل کی موجودگی میں اس کے اندر پھیلی تھی۔ اب دو چند ہو گئی اس کا جی چاہا کہ اس لڑکی کے دل کی بات، جو عورت بننے کے مراحل میں، اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی کو بتا دے اسے مجبور کرے کہ وہ اسے منع کرے کہ اتنی دیر بعد ابارشن خطرناک ہوتا ہے۔

حمزہ کو اپنے بدن میں سنسنی پھیلی محسوس ہوئی اس کا جی چاہا کہ گاڑی سے اتر جائے یا پھر زور زور سے مسافروں کو بتائے کہ ان کے ہمراہ ایک متوقع قاتل سفر کر رہا ہے اور۔ اور ایک لڑکی۔ جو آٹھ ماہ بعد اپنا بچہ ضائع کروانے جا رہی ہے اسے منع کرو۔ ۔ روکو۔ خدا کے لیے اس زندگی کو جو تمہاری کوکھ میں محبت کے گذرے دنوں کی یاد بن کر نمو پا رہی ہے۔ سماج کے خوف سے ضائع مت کرو۔ رک جاؤ۔ رک جاؤ۔"

"روک کے استاد جی" کنڈیکٹر کی آواز ابھری۔

"نن۔ نہیں۔ میں نے یہاں نہیں اترنا" حمزہ کے خشک لبوں سے بمشکل نکلا۔

"خود ہی تو کہا ہے رک جاؤ ۔۔ چلو استاد جی" کنڈیکٹر بولا۔

حمزہ نے شرمسار ہو کر مٹھیاں بھینچ لیں جو بھیگ رہی تھیں۔ آنکھیں میچ کر اس نے آس پاس کی ہر شے سے رشتہ توڑنا چاہا اور جب پلکوں کے سرے آپس میں مل رہے تھے تو اس نے ڈرائیور کا چہرہ دیکھا اور اسے پتہ چل گیا کہ وہ سڑک پہ اپنے آگے جاتی تمام گاڑیوں کو کراس کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

حمزہ نے اگلے دن اخبار کھولا تو اپنے وہم کی خبریں دیکھیں ایک شخص کہ جس کے گال پر زخم کا نشان، بند گلے کا کالا کوٹ، پرانی دشمنی، قتل، اور ایک نوجوان لڑکی آٹھ سالہ بچے کو جنم دے کر مر گئی۔ بچے کے باپ کی تلاش۔

حمزہ کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ ہاتھ گیلے ہونے لگے۔ اس نے چھوٹے بھائی کا مضمون دیکھے بغیر اخبار پرے پھینک دیا۔ لیکن جس طرح مسافر گاڑی میں شیشے سے باہر جھانک کر اس نے ہر شے سے لاتعلق ہونے کی بیکار کوشش کی تھی اس طرح اخبار پرے پھینک کر اس نے گذرے دن کے احوال کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن ناکام رہا اسے بہت سی باتیں جو ہو چکی تھیں پہلے سے معلوم تھیں۔ ؟

حمزہ کے ذہن میں زہر گھل چکا تھا۔ وہ جو بات نہ بھی جاننا چاہتا اسے معلوم

ہو جاتی ۔ دفتر میں اپنے کولیگز کے ذہن میں جنم لیتے ارادے اس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کے علم میں آجاتے راہ چلتے لوگوں کے من کے وسوسے خواہشیں، گھر کے بندوں کے دل کے بھید ۔ لوگ اس کے سامنے برہنہ ہوتے چلے گئے ۔ بری خواہشیں، نیک ارادے، مثبت منفی خیالات، ذلیل گھٹیا فیصلے فضول شرمناک سوچیں جنہوں نے آگے جا کر عملی روپ اختیار کرنا تھا، جونہی اس کے سامنے کھڑے بیٹھے یا گذرتے شخص کے ذہن میں اٹھتیں اس تک پہنچ جاتیں ۔ اسے معلوم ہو گیا کہ چیئرمین کی سیکرٹری چھٹی کے بعد اپنے دوست کا بس سٹاپ پر انتظار کرتی ہے اور اپنے تمام کولیگز کو نامرد سمجھتی ہے اسے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ چیئرمین نے اپنے پسند کے آدمی کو ٹھیکہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور تو اور حمزہ کو گلی میں جو کچھ ہوتا تھا، معلوم تھا ۔ اسے خبر تھی کہ چھوٹا بھائی آدھی رات کو چھت سے گذر کر پڑوس والوں کی لڑکی سے ملنے جاتا ہے اور دونوں بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہیں ۔ اسے معلوم ہو جاتا جب زہرہ اس کے پہلو میں لیٹ کر کسی اور ہستی کا سوچتی ہے ۔ اسے یہ بھی پتہ تھا ۔ کہ اس کے علاقے کا کونسلر ظاہری طور پر حکومت کی مخالفت کرتا ہے تاکہ ساکھ قائم رہے ورنہ اندر سے اس نے اپنی قیمت لگا دی ہے حمزہ کو یہ بھی خبر ہو جاتی کہ اس سے مخاطب شخص بات کرتے وقت کیا سوچ رہا ہوتا ہے لیکن یہ سارا علم، لوگوں کے دل کا بھید، اس کی خواہش اور ضرورت کے بالکل برعکس، اس تک پہنچ جاتا اور یہی اس کا عذاب تھا ۔ ابتدا میں اسے اپنے اس وصف پر حیرت بھی ہوئی اور سرشاری بھی لیکن آہستہ آہستہ اس کا خوف بڑھنے لگا گھٹن پھیلنے لگی ۔ اس نے دو تین موقعوں پر لوگوں کو ان کے دل کی بات بتائی تو سب نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا ۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہ سوچ رہا تھا ۔"

"بکواس نہ کیا کرو ۔ بالکل غلط بات ہے ۔"

"بڑا آیا۔ دل کے بھید جاننے والا۔"
"یار۔ بات تو ٹھیک ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔"
"اچھا۔ اچھا۔ چھوڑو کوئی اور بات کرو۔"
حمزہ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ دل کا بھید جاننے کے باوجود زبان نہیں کھولے مگر اپنے گھر میں وہ آزاد تھا۔ ایک دن اس نے اپنے بھائی کو بلایا۔
"آدھی رات کو چھت پہ گھومنا۔ اور ۔ اور۔ یہ تم نے فرار کا کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔"
چھوٹے بھائی نے حیران پریشان نظروں سے اسے گھورا اور سٹ پٹا کر رہ گیا۔
حمزہ دل میں ہنسنے لگا۔ لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کا خوف ستانے لگا کہ کہیں چھوٹا بھائی راز افشا ہونے کی وجہ سے غلط قدم نہ اُٹھا بیٹھے۔ اب اس نے راتوں کو جاگنا شروع کردیا اسے پتہ تھا کہ چھوٹا بھائی کس وقت چھت پہ جاتا ہے گو کہ اسے یقین تھا کہ اس کے دل میں جو بات آئے گی مجھ تک پہنچ جائے گی لیکن اپنی تشفی کی خاطر وہ رات کو کئی بار اُٹھ بیٹھتا۔
زہرہ نے اسے اس طرح مسہری پہ ٹانگیں لٹکائے دیکھا تو چونک اٹھی۔
"خیر تو ہے ۔ کیا بات ہے۔"
حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا اور کلاوے میں بھر لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک جھٹکے سے خود کو اس سے الگ کرلیا۔ اس ایک لمحے میں اس نے اپنی بیوی کے دل کا چور دیکھ لیا تھا۔ وہی مخصوص سنسنی اس کے جسم میں اٹھی جو بالآخر شرمساری بن کر اس کو کچوکے دینے لگی۔ وہ بڑا جانگسل لمحہ تھا جب اس نے بیوی کو کلاوہ میں بھرا اور زہرہ کئی سال پیچھے چلی گئی۔
"تمہیں اسی سے شادی کرلینی چاہیئے تھی۔ حمزہ نے تاسف سے کہا۔ زہرہ کا

منہ کھل گیا۔ حیرت اور خوف سے اس کے نقوش بے ربط ہونے لگے۔ "آ۔ آپ۔
۔ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا یہ درست نہیں۔ جب میں تمہارے قریب ہوتا ہوں۔ تم کسی اور کو اپنے قریب
لے آتی ہو۔؟

زہرہ شرم سے دہری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ حمزہ نے تاسف
اور ندامت کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"جب سے مجھے دل کے بھید پتہ چلنے شروع ہوئے ہیں۔ میری زندگی عذاب بن گئی
ہے اور۔ تو۔ اور۔ تم بھی اپنے دل کی بات نہیں چھپا سکتی۔

"م۔ میں۔ زہرہ نے کچھ کہنا چاہا۔"

میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ درست نہیں کہ پہلی رات ہی سے تم اس شخص کے
ساتھ بستر پر موجود ہوتی ہو۔ جس کے ساتھ تمہیں محبت تھی اور ابھی جب میں نے تمہیں
چھوا تھا تو تم نے اس کو یاد کیا تھا۔ تم نے اس بات کی خواہش کی تھی کہ کاش میری
جگہ وہ یہاں ہوتا۔ تمہارے بچے کا باپ ہوتا۔ سچ بتاؤ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات
نہیں تھی۔ تمہیں اس بچے کی قسم جو تمہارے پیٹ میں ہے"۔ زہرہ نے اثبات میں
سر ہلایا اور بے ہوش ہو گئی۔

ہم دونوں اوپن ایر میں بیٹھے تھے۔

حمزہ کئی دنوں سے میری تلاش میں تھا۔ میری اس سے رفاقت پرانے زمانوں
سے چلی آرہی ہے۔ سالوں ملاقات میں تعطل رہتا ہے اور جب ملتے ہیں تو یوں جیسے کبھی
جدا نہ ہوئے ہوں۔ ہر بار ہماری گفتگو کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے جہاں جدائی کے وقت
اختتام ہوا تھا۔ ہم قطعاً ایک دوسرے کو تلاش کر کے، فیصلہ کر کے، تاریخ اور مقام کا
تعین کر کے نہیں ملتے۔ صرف ایک دوسرے کی طلب محسوس کرتے ہیں۔ پھر اچانک کسی

دن کسی چورستے پہ، گلی کے موڑ پہ، گاڑی کی متوازی سیٹوں پہ، کسی ہوٹل یا شاپنگ سنٹر کے اندر ملاقات ہو جاتی ہے۔

اس دفعہ حمزہ نے میری شدید طلب محسوس کی۔ میری ضرورت اس کے لبوں پہ پیاس کی طرح پھیلی اور جب اس نے ہمیں یاد کیا تو میں لپکا۔ جہاں تھا اور جس حالت میں تھا اس کی سمت بڑھا۔ اور اب میں اس کے روبرو 'اوپن ایر ہوٹل کی گیارھویں منزل پہ بیٹھا تھا۔ نیچے شہر ایک وسیع متحرک کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا اوپن ایر ہوٹل جو آخری منزل پہ واقع تھا گاہکوں کی رونق سے آباد ہو چکا تھا۔ سورج کی ترچھی کرنیں شیشے کی میزوں سے ٹکرا کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ گیارھویں منزل پہ قائم اس نفیس مصنوعی ماحول میں ہلکی ہلکی موسیقی کے درمیان آوازوں کے جھونکے کھڑکیوں کی راہ سے آتی ہوا میں شامل ہو رہے تھے۔ مختلف میزوں پہ مختلف عمروں کے لوگ بیٹھے اپنی اپنی پسند کی چیزوں سے دل بہلا رہے تھے جن لوگوں کی کرسیاں کھڑکیوں کے پاس تھیں وہ ایک آدھ نگاہ نیچے رواں دواں زندگی سے لبریز شہر پہ بھی پھینک دیتے لیکن صرف ایک آدھ بھولی بھٹکی نگاہ کہ مسلسل اتنی بلندی سے دیکھنے کی صورت میں ہَول آنے لگتا تھا۔ اوپن ایر کے فرش پہ نرم مخملی قالین پہ رکھی میزوں کے درمیان گملوں میں قسم قسم کے پودے لگے تھے۔ بیرے ان کے پاس سے گزرتے وقت احتیاط سے قدم اٹھاتے کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سامنے جہاں صندلی کاؤنٹر بنا ہوا تھا ایک قدِ آدم جتنی بوتل میں لگا منی پلانٹ پھیل کر کھڑکی سے باہر کھلی ہوا میں جھول رہا تھا۔ ہوٹل کا منیجر قدِ آدم جتنی منی پلانٹ والی بوتل کے قریب بیٹھا بل بنا رہا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔

حمزہ نے پانی منگوا کر چائے کو کہہ دیا۔

میں نے ایک نظر نیچے ڈالی جہاں شہر اپنی پوری عریانی سمیت لیٹا ہوا تھا اس

عریاں شہر کو مسلسل دیکھنے میں خوف محسوس کرتے ہی میں نے نگاہ واپس موڑی اور حمزہ کو تکنے لگا۔

"میں اس طرح کی ملاقات کا عادی نہیں۔ خیریت تو ہے؟"

حمزہ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ اسے میرے بولنے سے قبل ہی پتہ چل گیا تھا کہ میں کیا خیال کن لفظوں میں ادا کروں گا۔ میں نے اپنی خفت چھپانے کے لیے اوپن ایریے گاہکوں کو تکنا شروع کر دیا۔

کونے والی میز پہ کھلی کھڑکی سے ٹیک لگائے ایک تنہا عورت کافی بنا رہی تھی اس کا سیاہ چشمہ سفید شیشے کی میز پہ رکھا تھا۔ اس کی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ بے نیازی سے سر جھٹک کر بالوں کو سنوارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو دوپہر کا سورج ہیرے پر اپنی کرن مارتا۔ ایک لشکارا سا پڑتا۔ ایسے ہی ایک لشکارے نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے دوبارہ دیکھوں۔ اس کے گلے میں ایک پتلی سیاہ ڈوری سے بندھا گول ہار آویزاں تھا جس کی وجہ سے اس کی سفید لمبی گردن بہت نمایاں ہو گئی تھی۔ جب اس نے کافی کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگایا تو گلے کی شفاف جلد کا تحرک نہایت آسانی سے مجھ تک پہنچ گیا اور جب لبوں سے مگ ہٹا کر اس نے میز پہ رکھا تو اس کی گول کلائی اور پتلی انگلیاں سارے ماحول پہ چھا گئیں وہ ایک ایسا چہرہ تھا جو کروڑوں قابلِ دید چہروں سے بنا تھا جسے بار بار دیکھنے کی آرزو کی جا سکتی تھی۔

حمزہ نے اچانک کہا

"تمہیں یہ عورت اچھی لگتی ہے؟"

میری محویت ٹوٹ گئی۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا۔"

"میں جان جاتا ہوں۔ یہی میرا المیہ ہے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کیا سوچ رہا ہے۔ لیکن میری بات کا کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا۔ میں اس عذاب سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

میں نے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔

حمزہ نے اپنی بات جاری رکھی "میری زندگی کے سارے اسرار ختم ہو گئے۔ میرے اندر لوگوں کے لیے جاذبیت نہیں رہی۔ مجھے رستہ بتاؤ۔"

"یہ ہُوا کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک شام میں چھت پہ کھڑا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ جیسے زہرہ نے مجھے پکارا ہے اور کہا ہے۔ شام کو چھت پہ نہیں گھومنا چاہیئے۔ میں نیچے اُتر آیا۔ تو اس نے یہ الفاظ جو میں پہلے جان چکا تھا ادا کیئے۔ اس کے بعد ان گنت موقعوں پر میں نے لوگوں کے من میں پلتی بات پائی اور ڈر گیا ہوں۔ یقین کرو مجھے شرمندگی بھی ہوئی اور خوف بھی آیا میں نے لوگوں کو قتل کے اور اغواء کے ارادے سے ناانصافی کی نیت سے سچی محبت کی خواہش میں دھوکہ دینے اور سے۔ اور احسان کرنے اور گھر بار اجاڑنے کی سوچیں لیے۔ ان چیزوں کے بارے میں دل ہی دل میں باتیں کرتے سنا ہے، دیکھا ہے اور وہی ہوا ہے جو مجھے معلوم تھا۔ جو میں نے چاہا تھا۔ مگر کسی کو بتا نہیں سکتا۔

[illegible]

ایک ادھ بار بتا کر دیکھا۔ بس نہ پوچھو۔ میرا یہ جاننا اذیت بن لیا ہے اور — اور — اب جانتے ہو کیا ہوا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کے دل کا بھید پا لیا ہے۔ زہرہ ابھی تک میرے ساتھ مجبوراً رہ رہی ہے۔ رات مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ ابھی تک اس آدمی کے ساتھ سانس لیتی ہے جو اس کا محبوب ہے مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنی ٹھنڈی کیوں ہے۔ رات میں نے اسے اپنے محبوب سے باتیں کرتی سُن لیا ہے۔"

خضر نے لمبی سانس لے کر گردن کرسی کی پشت پہ ٹکا دی اور ہانپنے لگا۔

"تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہوتا ہے" میں نے تشویش سے کہا۔ "کہیں تمہارا وہم نہ ہو۔"

حمزہ نے مجھے گھورا اور کہا۔ "یہ عورت تمہیں اچھی لگی ہے بہت سوں کی طرح تمہیں بھی یہ پسند آئی ہے مگر تم اسے آخری بار دیکھ رہے ہو۔ میں اس طرح کی چیزوں کا عادی ہو گیا ہوں۔ تمہیں پتہ نہیں ناں کہ قبل از وقت جان جاناں کتنا عذاب ہوتا ہے۔ اس طرح اس عورت کے بارے میں اگر میں۔ خیر چھوڑو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

"کہو کہو" میں نے اشتیاق سے کہا۔ "بات تو کرو۔"

"یہ عورت تھوڑی دیر کی مہمان ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کس بات کا فیصلہ؟"

"اگر وہ آج بھی نہ آیا تو یہ اپنی قسم پوری کر دے گی۔"

"کون نہیں آئے گا۔ کس بات کی قسم؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اسے جس کا انتظار ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ کاش کوئی روک سکتا۔ وہ اپنی موت پہ قادر ہو چکی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے خودکشی۔" میں نے ہنس کر کہا "کیسی احمقانہ بات کر رہے ہو۔ زندگی سے لبریز عورت کھڑکی سے کود کر مر جائے۔" میں چائے بنانے لگا جسے بیرا ہماری باتوں کے درمیان کسی وقت آ کر رکھ گیا تھا۔

حمزہ نے ایک طویل اداس سانس لے کر گردن آگے کی اور بولا۔

"کاش میں نہ جان پاتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

میں نے بے چینی سے حمزہ کو دیکھا اور پریشان سا ہو کر چائے پینے لگا۔

اپریل کی خوشگوار دھوپ اس کے چہرے پہ کانپ رہی تھی۔ ایک انجانا صدمہ

اس کے وجود کا احاطہ کیئے ہوا تھا میں اس کی ساری باتوں پہ دل ہی دل میں غور کرتا رہا مگر شبے کے ساتھ مجھے یقین نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور جب میں آہستہ سے نگاہیں ٹیڑھی کر کے حمزہ کو دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کسی متوقع حادثے کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ آنکھیں بند کیئے ہونٹ بھینچ کر اپنے وجود کی پوری توانائی کے ساتھ کسی چیز کو بھلا رہا ہے۔

نجانے کتنی دیر گذر گئی۔ کرنیں ذرا ترچھی ہونے لگیں تھیں۔ میں نے ہلکے سے اسے پکارا تو اس نے آنکھوں کے کناروں سے مجھے تکتے ہوئے کہا۔

"تم بے یقینی میں مبتلا ہو اور خوف زدہ بھی ہو۔ تم اسے جا کر اس فعل سے روکنا چاہتے ہو۔ اور۔ اور۔ تمہیں میرے دعویٰ پر اعتبار بھی نہیں۔ تمہارے اندر اس وقت متضاد ارادوں کے بگولے اٹھ رہے ہیں۔"

اس نے اپنی بات ختم کی اور گہری اداس آہ بھر کر چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

اچانک یکایک مجھے دیوار کی پرلی طرف کا منظر نظر آ گیا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اوپن ایر کی کھلی فضا میں چمکتے سورج کی چمکیلی دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ گاہکوں کا شور۔ بڑھ گیا۔ موسیقی کی آواز اونچی ہو گئی۔ بیروں کے قدم خواہ مخواہ گملوں سے ٹکرانے لگے، برتنوں کی بے جا کھڑکھڑاہٹ گیارھویں منزل پہ ناپسندیدہ عنصر بن کر سنائی دینے لگی۔ قد آدم شیشے کی بوتل میں لگا منی پلانٹ اچانک سمٹ کر سوکھ گیا ـــــ اور یہ سب اسی کے عظیم مصمم ارادہ کے طفیل تھا جو اس عورت میں پیدا ہو چکا تھا اور جسے بدلنے کے لیے میں نے اپنی جگہ چھوڑی تھی مگر اب دیر ہو چکی تھی کہ جب میں اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ مستطیل کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اپنے لباس کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ اس نے بالوں کو نفاست کے ساتھ ایک ترتیب عطا کی گلے میں لٹکے ہار کا زاویہ درست کیا۔ گہری سانس لے کر آسمان سے زمین تک ایک

خالی خالی نگاہ دوڑائی ۔ مجھے یوں لگا۔ کہ جیسے وہ ایک نا ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہو رہی ہے ۔ میں لپک کر اس کی طرف بڑھا ۔ مگر میرا پاؤں راستے میں رکھے ہوئے گملے سے جا ٹکرایا ۔ تب میں نے دیکھا کہ اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ اپنا پرسکون چہرہ ہلکے سے اوپر اٹھایا ، آنکھیں بند کیں اور گہرے تیقّن کے ساتھ ہوا میں اپنا پہلا قدم رکھا ۔ میں نے اسے اپنے سامنے گیارھویں منزل سے نیچے جاتے دیکھا ۔ لیکن یقین نہ کیا ۔ میں نے اس کے دل کا بھید حمزہ سے پایا پر اعتبار نہ آیا ۔ میں یقین و اعتبار سے محروم شخص سوا نیزے پہ آئے ، سورج کی تپش میں جھلستی چیزوں میں ایک چیز اپنے گرد حمزہ کے زندہ قہقہے کو محسوس کرتا ہوں ۔

دنوں کے مقدر میں گذر جانا لکھا ہوتا ہے ان گذرتے دنوں میں کبھی کبھار میں حمزہ کو ملنے فونٹین ہاؤس[1] چلا جاتا ہوں ۔ اس کی حالت اب قدرے بہتر ہے پہلے وہ دوسروں کے من کے بھید جان جاتا تھا اور اب اپنا حسب نسب اور حال جاننے کے لیے اسے دوسروں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے ۔

---

[1] ذہنی مریضوں کا ہسپتال

جھیل ... جنگل قدیم بوڑھا

"اپنی آنکھوں کے سامنے ..... ان گناہگار آنکھوں کے سامنے، میں نے اسے پانی میں اترتے دیکھا، میرے دیکھتے ہی دیکھتے، میرے شور مچانے سے قبل ـــــ اسے بچانے سے قبل۔ وہ ڈوب گئی۔ جہاں اس کا بدن پانی میں اترا۔ وہاں تھوڑی دیر کے لئے لہروں کے دائرے بنے اور پھر بطخوں کا شور ان لہروں پہ پھیل گیا ـــــ ساری جھیل پہ، سارے جنگل میں بطخوں کے چیخنے کی آواز پھیل گئی۔ اس رات جنگل کے سارے پرندے روتے رہے اور ـــــ ہاں۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا ہوں۔ ڈوبنے والی کے ساتھ جو شخص آیا تھا تھوڑی دیر کنارے پہ کھڑا رہا۔ حیران گم سم۔ پھر واپس پلٹا اور اپنی نیلی کار میں بیٹھ کر چلا گیا ـــــ واپس چلا گیا۔"

کئی دنوں سے ہم سن رہے تھے کہ ایک شخص اپنی نیلی سپورٹس گاڑی میں جھیل پہ آتا ہے جب اس کی کار درختوں کے جھنڈ سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ ہارن بجانے لگتا ہے۔ جسے سن کر جھیل کے ٹھہرے پانی میں ہلچل اٹھتی ہے کہ پانی پہ تیرتی بطخیں اس مخصوص آواز کی منتظر رہتی ہیں۔ چھٹی کے دن کی سہ پہر ان کے لئے بلاوے کا وقت ہوتا ہے۔ جھیل کے پرلے کنارے سے لے کر بائیں طرف جہاں سنتھے اور کیکر کے جھنڈ ہیں اور راستے کے پاس جہاں لکڑی کے تختے پڑے ہیں۔ بطخوں کی ٹولیاں منتظر عاشق کی بے صبری کے ساتھ کنارے کی جانب لپکتی ہیں۔ ہارن کی آواز سن کر ان کے بوجھل بدن سبک ہو جاتے ہیں اور جب وہ گاڑی کنارے پہ کھڑی کر کے چند بار رک رک کر ہارن بجاتا تو بطخوں کا انبوہ چونچ کھول

کر بھاری پر پھڑ پھڑا کر بے چینی کے ساتھ اپنی بھدی کرخت آواز کا طوفان کھڑا کر دیتا اور پھر وہ یک دم ہاتھ ہارن سے ہٹا لیتا، ماتھے پہ بکھرے بالوں کو سنوارتا ہوا گاڑی سے باہر نکل آتا۔

اس کے باہر نکلتے ہی بطخیں ایک بار پھر زور زور سے چیخنے لگتیں۔ تب وہ پچھلی سیٹ پہ رکھی ٹوکری اٹھاتا اور کنارے کے قریب آجاتا اور آہستہ سے ٹوکری کھول کر اس میں ہاتھ ڈالتا اور کچھ چیز نکال کر آبی پرندوں کی طرف پھینکنے لگتا۔ شور مچاتی مخلوق پُرسکون ہو جاتی اور پانی کے اندر کناروں پہ گرتے چوگے کی طرف دھیان لگ جاتا۔ تھوڑی دیر کے لئے جھیل پہ، جنگل میں اور اس شخص کے اردگرد خاموشی پھیل جاتی لیکن جونہی وہ جانے کے لئے واپس مڑتا تو آبی پرندوں کا جھنڈ پانی سے باہر نکل آتا شور مچاتا، کراں کراں کے شور میں، پھیلے ہوئے پنجے اور بوجھل پر لئے سڑک پہ آکر اس کی گاڑی کے چار چفیرے پھیل جاتا اور وہ بہت احتیاط کے ساتھ اپنی نیلی سپورٹس سٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ آبی پرندوں میں راہ بنا کر، درختوں کے جھنڈ کے پاس جا کر پوری سپیڈ سے گاڑی دوڑاتا ہوا واپس چلا جاتا۔

اُس کے جانے کے بعد ایک گھنی سُنسان چپ چاروں طرف پھیل جاتی۔

سپورٹس کار میں آنے والا شخص کون تھا؟

کسی کو پتہ نہ تھا۔

اس کی وجیہہ صورت، طویل قامت، ہستی میں جو راز پوشیدہ تھا اس کا اپنا تھا سراسر اس کا اپنا ذاتی، راز جو کسی پر عیاں نہ تھا۔

لوگوں کو صرف اتنا پتہ تھا کہ ایک شخص چھٹی کے دن سہ پہر ڈھلے جب سائے قد نکالنے لگتے ہیں وہاں آتا ہے اور اس کے ہارن کی آواز سن کر بطخیں شور مچاتی بھاگتی ہوئی کنارے پر آجاتی ہیں اور اس کے ہاتھوں کا چوگا چُگ کر اس کی واپسی تک خشک زمین پہ کھڑی رہتی ہیں۔

ہمیں اس شخص کو دیکھنے کی آرزو تھی۔

سنا ہے کہ جھیل اور جنگل زمانوں سے قائم ہے۔ شمال کی جانب سے آنے والے راج ہنس اور بگلے یہاں تھوڑی دیر سستا کر جنوب کے تپتے میدانوں کی سمت اڑ جایا کرتے تھے۔

اُن زمانوں میں قافلے سے بچھڑے لوگ ، دارالخلافے کے باغی عشق لاحاصل کے شکار بندے اور عشق خدا کے شکار درویش گاہے بگاہے اس جنگل سے گزرتے اور جھیل کا پانی پیا کرتے تھے یہ باتیں ہمیں اس شخص نے بتائیں جس نے کہا تھا ۔

" اپنی آنکھوں کے سامنے ——— ان گناہگار آنکھوں کے سامنے ——— میں نے اسے پانی میں اترتے دیکھا ، میرے دیکھتے دیکھتے ، میرے شور مچانے سے قبل اسے بچانے سے قبل وہ ڈوب گئی ۔ جہاں اس کا بدن پانی میں اترا وہاں تھوڑی دیر کے لئے لہروں کے دائرے بنے اور پھر بطخوں کا شور ان لہروں پہ پھیل گیا ۔ ساری جھیل سارے جنگل میں بطخوں کے چیخنے کی آواز پھیل گئی ۔ ڈوبنے والی کے ساتھ جو شخص آیا تھا تھوڑی دیر کنارے پہ کھڑا رہا اور پھر واپس چلا گیا ۔"

ہم نے اس کی بات کا یقین کر لیا کہ اس کے چہرے پہ صدیوں کا سچ جھریاں بن کر پھیلا ہوا تھا ۔ قدیم بوڑھا جسے دیکھ کر ہم حیران ہو رہے تھے مگر ہمیں جنگل ، جھیل اور اس شخص کو دیکھنے کی آرزو تھی جو اپنی نیلی سپورٹس کار میں آبی پرندوں کا رزق لے کر آتا ہے ۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی ۔

" آپ کو میری بات کا یقین نہیں ؟"

میں نے خضر کی طرف دیکھا جو جھیل پہ نگاہیں جمائے مچھلی پکڑنے کا سامان کھول رہا تھا جواب نہ پا کر بوڑھا بولا ۔

" مچھلیاں یہاں نہیں ہوتیں ۔ آپ کو مایوسی ہو گی ۔"

" کیوں ؟" ہمارے منہ سے اچانک نکلا ۔

" پچھلے کئی سالوں سے عجیب سا ہو رہا ہے ۔ شاید زمین کی حد بندی کا نتیجہ ہے یا پھر پانی کی بندر بانٹ کی وجہ سے ۔"

" ہم سمجھے نہیں ۔"

" پہلے تو جنگل جانوروں سے خالی ہوا اور گھونسلے پرندوں سے اور پھر مچھلیاں آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا ۔

"بق - یقین ہے - ہے" ہمارے لبوں سے نکلا۔

"مچھلیاں - مُردہ مچھلیاں۔ پانی پہ تیرنے لگیں اور یوں ساری جھیل خالی ہو گئی۔"

"لیکن یہ بطخیں"

"یہ تو اس کا انتظار کرتی ہیں۔"

"کون - کہاں سے آتا ہے وہ" - خضر نے بے یقینی سے پوچھا۔

"کوئی پتہ نہیں۔ ناں ہی کبھی پوچھا ہے - میرا کیا ہے مجھے خود پتہ نہیں۔ کوئی بلائے تو بات کر لیتا ہوں۔ بیٹھ جاتا ہوں۔ پہلے بہت لوگ آتے تھے۔ شہر سے .... بچے۔ بوڑھے۔ عورتیں۔ خاص طور پر چھٹی کے دن تو بہت لوگ ہوتے تھے پھر جنگل کٹنا شروع ہوا۔ لوگ کم ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ یہاں بیرکس بن گئیں پرلی طرف جہاں بیلا تھا باگھ گھوما کرتے تھے۔ اب وہاں چاند ماری کا میدان ہے جگہ جگہ باڑ لگا دی گئی - وہ سامنے دیکھ رہے ہو ناں - باڑھ۔"

"ہاں۔ ہاں" ہم نے اُدھر دیکھ کر کہا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔

"رونق کم ہو گئی لوگ جو کم ہو گئے تھے۔ ساری رونق تو بندوں کے دم سے ہے۔ جگہ جگہ بورڈ لگا دیئے گئے ہیں وہ دیکھ رہے ہو ناں سامنے" اس نے پھر ہاتھ پھیلا کر بازو کھول کر اشارہ کیا۔

ہم نے اس کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھا جہاں ممنوعہ علاقہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"اب تو کبھی کبھار کوئی آ جاتا ہے یا چھٹی کے دن، وہ آتا ہے آج بھی آئے گا۔ مگر سُنا ہے کہ اب جھیل بھی خشک کرنے والے ہیں۔ تم لوگ ادھر شہر میں رہتے ہو۔ یہ خبر کتنی سچ ہے"

"ہم تو مچھلی کے شکار کو آئے ہیں یا پھر اس کو دیکھنے۔"

وہ ہنسا تو اس کا بڑھاپا چند سال آگے چلا گیا۔

"شکار ــــــ وہ تو ایک زمانہ ہوا یہاں ہوتا تھا جب شمال کے یخ علاقوں سے پرندے آتے تھے۔ جنگل میں مور ناچتا تھا اور ادھر بیلے میں۔ ہانکا لگانے والوں کو میں رستہ بتایا کرتا تھا۔ تمہیں میری باتوں کا اعتبار نہیں۔"

میں نے خضر کی طرف دیکھا جو بے یقینی سے بوڑھے کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں مچھلی کانٹا تھا اور بائیں ہاتھ میں ڈور کا گچھا اور اس کے کھلے گریبان سے بال جھانک رہے تھے۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں تجسس اور بے اعتباری کا ملا جلا رنگ تھا۔ اس رنگ کے درمیان جھیل کا عکس ڈول رہا تھا۔

"اعتبار ہے۔ آپ کی باتوں پہ پورا یقین ہے لیکن یہ بتائیے کہ مچھلیاں کس حصہ میں ہوں گی"۔ خضر بولا۔

"کہیں بھی نہیں۔ وہ زمانے گئے جب یہاں پرندے بولا کرتے تھے۔ اور جنگل بھیڑیوں کی غراہٹ سے کانپتا تھا اب تو چاند ماری کے بارود کی بُو اور جنگل کاٹنے کے آرے کی آواز کے علاوہ کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ اب تو یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں جیسے آپ آئے ہیں یا وہ نیلی کار والا"۔

"آج تو چھٹی کا دن ہے۔ ہم تو سیر کرنے آئے ہیں۔ ہم نے بہت ذکر سُنا تھا اس جگہ کا اور اس شخص کا جو ــــــ اور ــــــ اور ــــــ خضر نے آہستہ سے کہا" اور آپ کا ذکر تو بہت سُنا تھا"۔

"جھوٹ غلط۔ مجھے پتہ تھا کہ میری باتوں کا یقین نہیں کرو گے۔ اچھا بتاؤ میرے بارے میں آپ کو کیا پتہ ہے"؟

ہم دونوں نے لاجواب ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا خضر نے بوڑھے سے آنکھیں چرائیں اور جلدی سے مچھلی کانٹا پانی کی طرف اُچھال دیا۔

"جواب نہیں دیا"۔ بوڑھے نے کہا۔

"ہمیں کسی نے بتایا تھا" میں نے کہنا شروع کیا "کہ اس جھیل پہ ایک بہت بوڑھا شخص رہتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ باوجود کوشش کے وہ آپ کو یہاں سے بے دخل نہیں کر سکے۔

"بیدخل نہیں مہاجر کہو؟ بوڑھے نے تصحیح کی ــــــ مگر کون لوگ"۔

"جنہوں نے یہاں جگہ جگہ باڑھیں لگائی ہیں۔ ہر شے کا حُسن اجاڑ دیا ہے۔ وہ آپ کو نکالنا چاہتے ہیں مگر آپ پرانے وقتوں سے یہاں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟

کچھ پرانے وقت! نوح کی کشتی والا واقعہ تو سامنے کی بات ہے یہ جو تختے تم دیکھ رہے ہو ناں جن پر کچھ لکھا ہوا ہے" بوڑھے نے راستے کے پاس جہاں لکڑی کے تختوں پہ ممنوعہ علاقہ کے الفاظ لکھے تھے اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہ تختے نوح کی کشتی کے ہیں"

"اور آپ اس میں سوار تھے"۔ خضر کے کانٹے میں مچھلی نہ لگی تو وہ جل کر بولا۔ اور پھر آہستہ سے کہنے لگا" عرصہ بعد کوئی سامع ملا ہے۔ ممکن ہے پاگل پن کی ایک قسم یہ بھی ہو کہ آدمی خود کو قدیم باشندہ جان کر پرانے واقعات سے اپنا تعلق جوڑے"۔

بوڑھے نے اس کی بات سن لی۔ مگر بُرا منائے بغیر مُسکرا کر بولا۔

"تمہارے کانٹے میں مچھلی نہ لگی تو خود کو لگا لینا۔ اپنا شکار کر لینا۔ ویسے احتیاط کرنا آج چھٹی کا دن ہے اور کیا پتہ وہ لوگ بھی آ جائیں اور تم دونوں کو یہاں دیکھ کر پکڑ لیں۔

"ایسے وقت آپ کیا کرتے ہیں"۔ میں نے پوچھا۔

"چھپ جاتا ہوں۔ میں اس زمین کا پرانا مکین ہوں ابھی اس جنگل میں میرے کئی گھر ہیں۔ چھپ جاتا ہوں ان کے زد سے بچ جاتا ہوں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے کتوں کو میری تلاش پہ لگا دیا۔ بُو سونگھنے والے کتے۔ کئی دفعہ وہ میرے پاؤں چاٹ کر لوٹ گئے۔ مجھے تو اس کی فکر رہتی ہے جو بطخوں کو دانہ ڈالنے آتا ہے اب تو یہاں وہی رہ گیا ہے یا پھر راتوں کا رونا۔

"کس کا رونا"۔

"جھیل کی تہہ سے رات کو رونے کی آواز آتی ہے۔ ڈوب جانے والی کی آواز، پانی کے اندر سے سسکیاں ابھرتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس کو یاد کر کے روتی ہے۔ اس کی اپنی ہو گی ناں۔ اپنے ہی تو روتے ہیں اور وہ بھی تو آتا ہے یہاں اس کی خاطر۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟

"بالکل۔ بالکل"

خضر کی ڈور پانی میں ساکت تھی۔

اس وقت سورج دھیرے دھیرے درختوں کی اوٹ میں جا رہا تھا۔ دور شہر کی آوازیں رُک رُک کر گھٹ گھٹ کر، ہوا کے طشت پہ تیرتی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ معاً مجھے واپسی کا

خیال آیا۔ شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری ہے۔

خضر کو بھی یہاں آنے کی کیا سوجھی یہ وقت مچھلی لگنے کا تو نہیں اور پھر بوڑھے کی باتیں کیا پتہ سچ ہوں۔

پچھلے کئی دنوں سے ہم شہر سے باہر نکلنے کی سوچ رہے تھے، باہر جانے کے لئے اجازت نامہ ضروری تھا جس کی درخواست ہم نے بہت پہلے دے دی تھی بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی جگہ جگہ بنی چیک پوسٹوں پہ روک کر تلاشی لی گئی۔ بڑی کوفت سے یہاں تک پہنچے اور اب واپسی کا مسئلہ درپیش تھا کہ شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری ہے۔ جب سے اپنوں اور غیروں کی پہچان ختم ہوئی ہے شہر میں شبہے کی دہشت گشت کرتی رہتی ہے۔ کسی وقت بھی روکا جا سکتا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے بند کیا جا سکتا ہے لہٰذا وقت پر گھر پہنچنا ضروری ہے کہ واپسی کا وقت نزدیک تھا۔

"واپسی کا وقت ہو رہا ہے خضر، آؤ چلیں" میں نے زور سے کہا کہ اس وقت سورج دھیرے دھیرے غروب کی سیڑھی اُتر رہا تھا سائے لمبے ہونے لگے تھے اور فضا میں پھیلی اداسی ساموں کی راہ سے بدن میں ذخیرہ ہو رہی تھی۔

میں نے خضر کو پھر پکارا۔

اس نے پلٹ کر بوڑھے کو دیکھا پھر مجھے اور سرگوشیوں میں بولا۔

"آوازیں سُن رہے ہو؟؟

ہوا کے طشت پر آوازوں کی کپکپاہٹ تھی۔

"چچ۔ چلو۔ جاؤ۔ چھپ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ بوڑھا ہاتھ ہلا کر بولا۔ اور پھر ایک طرف کو تیزی سے بھاگ گیا۔ ہم نے صرف اس کی پشت دیکھی جو سنتے اور کیکر کے گھنے جھنڈ کے پاس کہیں غائب ہو گئی تھی۔

خضر نے ہاتھ پر ڈور لپیٹی اور بولا۔

"آؤ چھپ جائیں۔ دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں"۔

"واپس چلو۔ شام ہو رہی ہے۔ مصیبت آ جائے گی"۔

میری بات پہ کان دھرے بغیر اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور جھیل کے ایک طرف پتھروں کے ڈھیر کے پاس لے گیا۔

نوکیلے کھردرے پتھر ہماری کہنیوں اور ٹانگوں میں چبھ رہے تھے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چاند ماری میدان سے جیپوں کا قافلہ نمودار ہوا۔ بڑی بڑی گیس لائٹیں، سردے کے آلات، آرہ مشینیں، جال اور بارود سے بھری پیٹیوں کا قافلہ جھیل کے پرلے کنارے پہ آ کر رک گیا۔ پھر اگلے حصے سے چند آدمی نکلے۔ انہوں نے کمال سرعت کے ساتھ آبی پرندوں پر جال پھینکا نہ کوئی شور مچا نہ کسی پرندے نے آواز نکالی۔ ایک ہولناک چپ پھر کے آخری دموں پہ پھیل گئی۔ آبی پرندوں سے بھرا جال انہوں نے کنارے کی طرف کھینچا اور پھر واپس ہو لئے۔

قافلے نے جھیل کے پرلے کنارے پہ پڑاؤ کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جھیل کی سطح پر نچے ہوئے پَر تیر رہے تھے۔

نوکیلے کھردرے پتھر ہماری کہنیوں اور ٹانگوں میں چبھ رہے تھے۔

ہم خوف کے مارے ایک دوسرے کی پناہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک ہارن کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔

نیلی سپورٹس کار درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوئی۔ ہارن کی آواز جنگل میں پھیلی مگر اس کا جواب چاروں طرف سے گہری خاموشی کی صورت میں آیا۔

کنارے پر آ کر رکی کار سے وجیہہ صورت طویل قامت شخص جسے دیکھنے کی آرزو تھی، باہر نکلا۔ حیران گم سُم جھیل کی سطح پہ تیرتے پروں کو دیکھ کر اس نے پچھلی سیٹ پہ رکھی ٹوکری اٹھائی اور چند قدم آگے بڑھ کر جھیل کے کنارے پہ پانی کے پاس آ رکا۔

حیران گم سم آنکھوں کے ساتھ اس نے جنگل کو دیکھا اور پھر جھیل کی طرف بڑھنے لگا۔

درختوں کی اوٹ سے طلوع ہوتی شام میں، ہم نے دیکھا کہ ایک شخص نہایت سکون کے ساتھ ہاتھوں میں ٹوکری لئے، دھیرے دھیرے جھیل کے پانی میں اتر رہا ہے ایک ایک قدم اٹھا کر، بغیر کسی خوف، ہچکچاہٹ کے، رتی بھر شبہے کے بغیر، ایک اوتاری شان کے ساتھ پانی

میں گم ہو رہا ہے۔

ڈوب جانے والوں کی سسکیاں، جھیل، جنگل اور قدیم بوڑھے کی آہیں ——— اس وقت ہمیں کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

پُورے ایمان کی تلاش

فتیح محمدؔ ملک

احمد داؤد، نئے افسانے کا جانا پہچانا نام ہے مگر اس کا فن نئے افسانے کے متعینہ حدود میں پابند نہیں۔ نیا افسانہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔؟ اس سوال کی وضاحت کرنے والوں میں گوپی چند نارنگ ہوں یا شمس الرحمان فاروقی، محمود ہاشمی ہوں یا قمر احسن — سب کے سب اس بات پر متفق ہیں۔ کہ نیا افسانہ سیاسی مقصدیت اور نظریاتی وابستگی کی نفی پر اصرار کرتا ہے۔ مگر احمد داؤد کا افسانہ، نئے افسانے کے اس فارمولے سے انحراف کا افسانہ ہے۔ احمد داؤد نے رواں صدی کی ساتویں دہائی میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور یہ وہ زمانہ ہے جب حقیقت نگاری کی فارمولا کہانی کے خلاف ردِ عمل سے وجود میں آنے والا نیا افسانہ ایک نئے فارمولے کی زد میں آچکا تھا۔ غیر مبہم سماجی معنویت، دوٹوک سیاسی مقصدیت، اور نظریاتی وفور نئے افسانہ نگار کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دیئے جا چکے تھے اور ابہام، اسرار اور عدم ابلاغ کو جرأتِ اظہار کا نام دیا جانے لگا تھا۔ احمد داؤد نے اپنا تخلیقی سفر پرانے فارمولے کو ردّ اور نئے فارمولے کو اختیار کرنے والے باغی افسانہ نگاروں کے فنی تجربات کے سلسلے میں شروع کیا مگر وہ افسانے کی نئی جمالیات کا ہو کر رہ جانے کی بجائے ایک جارحانہ نظریاتی آہنگ کے ساتھ گردوپیش کی سفاک حقیقتوں کی مصوری میں کھو گیا۔ اس کے افسانے

سیاسی جبریت اور تہذیبی جمود سے متصادم سے پھوٹتے ہیں۔ افسانہ "دھمکی اور پرندے کا گوشت" میں مرکزی کردار۔

"نیلی خلا کے طشت پر تیرتے پرندوں کو دیکھ کر بولا ۔ پرندے ۔ کیا ہمیں ان جیسی آزادی نہیں مل سکتی؟ دائیں طرف کی بلند و وسیع عمارت کے کونے سے پرندوں کی ایک ڈار نکلی اور اس کے غلام جذبوں کی رسی کو جھنجھوڑتی سمندر کے ماتھے پر بنی تکون کی جانب پھیل گئی ۔ اگر میرے پَر ہوتے تو......؟"

گھٹی ہوئی تنگ و تاریک فضا سے آزاد و بے کراں وسعتوں میں پھیل جانے کی یہ تمنا احمد داؤد کے اکثر و بیشتر کرداروں کے دل میں موجزن ہے :-

"وہ باہر نکلنا چاہتا تھا مگر راستے بند تھے۔" —(گل گامش)

"ایک خلش، ایک بوجھل سا غبار دل پر! اپنے جسم کی دیواریں توڑ کر آزاد ہونے کی خواہش۔!" —(ایک اجنبی روگ)

اور: "چوراہے میں ۔ جہاں سڑکوں نے چبوترے کا تاج پہن رکھا تھا۔ وہی عورت جسے ہم بچپن سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ کھڑی تھی۔ چبوترے کے پول کی جلتی بجھتی بتیوں کے ساتھ ساتھ وہ باہیں پھیلاتی اور چیخ کر کہتی:

"آگے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے نلائی کرنا ہے۔" —(عجائب گھر)

آزادی اور وسعت کی یہ تمنا مابعد الطبیعاتی سے زیادہ ٹھوس زمینی پس منظر رکھتی ہے۔ بے شک "کمپوزیشن ۹" میں موسیٰ و فرعون کی قرآنی حکایت کے ساتھ ساتھ حق بات کے اظہار کی پاداش میں دار و رسن کی آواز پر لبیک کہنے والوں یا پھر باطل کے ساتھ صلح کرنے کی بجائے ترک دنیا کر جانے والوں کی یادوں نے ماحول کی تہ در تہ ظلمت میں نور کا ایک جال سا بُن رکھا ہے۔ بلاشبہ روحانی اور تہذیبی تکمیل کی خاطر احمد داؤد کے بیشتر کردار ماحول کی گھٹن اور ذہنی و نفسیاتی قید و بند کی فضا سے رہائی کی آرزو میں اپنی جان تک سے گذر

جاتے ہیں، طبعی دنیا اور رواں وقت کی حدود سے آگے نکل جاتے ہیں مگر اس کے افسانوں کا مجموعی تاثر ماورائیت کا نہیں حقیقت کا ہے، گریز کا نہیں ستیز کا ہے۔ یہ بات اس کے فن کے مخصوص زمانی و مکانی سیاق و سباق پر غور کرنے سے روشن تر ہو جاتی ہے۔ پرندوں کی مانند آزاد ہو جانے کی اس تمنا کی تاریخی اور معاشرتی معنویت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ سامراج کی براہ راست غلامی سے آزادی کے بعد ہمارے ہاں آزادی کے لامحدود امکانات کو بروئے کار لانے کے خواب مسلسل چکنا چور ہوتے آئے ہیں۔ سامراجی دور کے ادارے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے آئے ہیں اور عوامی اضطراب کی بدولت آنے والی ہر نئی تبدیلی نئی بربادی کی سوغات لاتی رہی ہے اور ایک ابوالہول کو چکنا چور کرنے والا ہجوم ریزہ ریزہ بت کے ٹکڑوں سے نیا ابوالہول تعمیر ہونے کا منظر دیکھتا آیا ہے:

"ایک گیا ہے اور دوسرا آیا ہے۔ جو اس سے بھی بدتر ہے اور پھر تیسرا آئے گا جس کے پاس ہمارے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کا مرہم ہے۔ آہستہ بولو، یہاں قدم قدم پہ سفید کپڑے والوں کی پرچھائیاں چمٹی ہوئی ہیں۔۔ کسی اور نے مدھم سی آواز میں اپنے خوف کا اظہار کیا۔ لوگوں نے اس کی باتوں کو اپنے دامن میں باندھ لیا۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ ابوالہول کے بت کی جانب پیش قدمی کرتے۔ سب نے چوراہے پر مصلوب سچائی کو اپنی نگاہوں کی نرم حدت سے بھرپور محبت بخشی سبے چارے نے اپنے آپ کو دوسروں پر قربان کر دیا مگر ابوالہول کے حواریوں نے بات پوری نہ کرنے دی۔ اور انہیں منتشر کر دیا اور لوگ اپنے ہاتھوں میں کنکریوں کو بھینچے پناہ گاہوں کو دوڑے اور جب وہ اپنی پناہ گاہوں کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ تو انہوں نے چھتوں اور کواڑوں کی اوٹ سے جھانکتی عورتوں کو دیکھا جن کی آنکھوں میں انتظار کے کانٹے اُگے ہوئے تھے۔ جن کی پلکیں لرز لرز کر

کہہ رہی تھیں کہ کب نیا سورج طلوع ہو کر ان کے چہروں کو روشن کرے گا۔"

(داستان شبِ رواں کی)

سامراج کی براہِ راست غلامی سے نکل کر رفتہ رفتہ سامراج کی بالواسطہ غلامی میں مبتلا ہو جانے والے یہ لوگ اپنی نادیدہ زنجیروں کی جھنکار کو ایک گہرے دکھ کے احساس کے ساتھ سنتے ہیں۔ اور منتظر ہیں کہ وہ نیا سورج طلوع ہو جسکی روشنی میں بالواسطہ غلامی کی غیر مرئی زنجیریں دکھلائی پڑیں۔ ان لوگوں میں عجائب گھر کی وہ عورت بھی شامل ہے جس کا ایک پاؤں زنجیر سے بندھا ہے اور ایک پاؤں آزاد ہے مگر جو ننگا ئی کرنا چاہتی ہے۔ عجائب گھر ۳۔ کا وہ شخص بھی ان میں موجود ہے جو صبح ہونے سے پہلے کسی نیک لمحے میں شہر کو آگ لگا" دینا چاہتا ہے یہاں وحشی اور پرندے کا گوشت، کے وہ تمام لوگ بھی رواں دواں ہیں۔ جو آنکھیں پاؤں پہ دھر کر چلتے ہیں جو ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں جو اظہار چاہتے ہیں لیکن ڈرتے ہیں، کہ سننے والا قومی سلامتی کے نام پر پھنسوا نہ دے۔" اور کمپوزیشن ۹۷ کے اس واحد متکلم کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے جو یوں فریاد کناں ہے۔

"میری بائیں کلائی اور دائیں ٹانگ کو زنجیر سے باندھ کر ـــــ زنجیر کے سرے کو زمین کے اندر گہرائی میں لے جا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ میرے احتجاج کے باوجود انھوں نے زنجیر کے کنڈے بہت نیچے پھنسائے ہیں۔"

اس ہجوم کا سناٹا آواز کا منتظر ہے۔" (عذاب المنار) کسی ایسے مسیحا کی آواز کا منتظر ہے جو لے ڈھور ڈنگروں کی سطح سے اوپر اٹھا کر آزاد انسانوں کا مقام دلائے۔ یہ لوگ کسی نجات دہندہ کے انتظار میں ہیں اور انہیں پتہ ہی نہیں کہ ان کے گھروں، ان کی گلیوں اور ان کے شہروں کے نیچے سرنگیں بچھائی جا چکی ہیں۔ انہیں" اتنا احساس بھی نہیں رہا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ پانی کی لائن گذرتی ہے یا زہر کی۔"! یہ منتظر ہیں مگر وہ "بوڑھی برگزیدہ آنکھیں" بند ہو چکی ہیں۔ جنھوں نے خفیہ سرنگوں میں سے سازشی آنکھوں، کالے پنکھوں اور مشکوک چادروں

والے ہزاروں اجنبیوں کو نکلتے اور وطن کی مٹی کو مفتوح کرتے دیکھا تھا۔ اور خبردار کیا تھا کہ

"وہ تمہارے دن اور تمہاری راتیں چھیننے کے لیے آ چکے ہیں اور تمہارے شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔"

—(بوڑھی برگزیدہ آنکھیں)

اس انتباہ کو پاگل پن گردانتے والے اب بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ گندم بو کر جو کاٹنا کیونکر ان کا مقدر بنا۔؟ —— اس سوال کے جواب کی تلاش ان میں سے ایک کو وہاں لے آئی جہاں:

"اندر کمرے میں انہیں بہت دیر ہو چلی ہے۔

میں ہنکارا بھرے بغیر جھکی جھکی نظریں چاروں طرف دوڑاتا ہوں۔ دبے پاؤں کمرے میں حرکت کرتا ہوں اور چپ کی چق کے ساتھ لگ کر اندر جھانکتا ہوں کہ اب انتظار گناہ محسوس ہونے لگا ہے۔ چق سے پرے کمرے کے مدھم اجالے میں کلرک اور اس کا افسر سر جھکائے کسی اجنبی کے سامنے کھڑے ہیں۔ اجنبی اپنے سر سے ایک بڑا سا ہیٹ اتار کر اس میں جو کے دانے ڈال رہا ہے میں ہیٹ پر بنے ستارے گننے لگتا ہوں۔ ستاروں والا ہیٹ مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔"

(بیج دینے والے)

یوں احمد داؤد کی نگاہیں سات سمندر پار ان نادیدہ ہاتھوں تک پہنچ جاتی ہیں جنہوں نے اُن زنجیروں کے سرے کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جو ہمارے جسدِ اجتماعی کے اردگرد لپٹی ہیں۔ احمد داؤد اپنی فنی جدوجہد سے ان زنجیروں کو توڑنے میں سرگرم عمل ہے اور یہی آزادی کی تڑپ اس کی تخلیقی زندگی کا جذبۂ محرکہ ہے:

"اس نے کئی دفعہ کوشش کی۔ ان المیوں کے بارے میں سوچنا چھوڑا، لیکن ناکام رہا۔ آدمی ہونے کا جواز تو سوچنے میں ہے، اور جب وہ اپنے ہونے کی شہادت دوسرے کو دیتا تو مکروہ ضابطوں کا خوف اسے بے بس بنا دیتا۔ دراصل

وہ قسطوں میں ہلاک ہو رہا تھا۔

پچھلے دنوں جب اُسے میں یہ بتلائے بغیر کہ میں کون سی منزل پہ رہتا ہوں اپنے کمرے میں لایا تو وہ کہنے لگا:

تم آسمان کے بہت قریب رہتے ہو۔ یہ پرندے جنہیں دیکھ کر آزادی کی امنگ ابھرتی ہے کیا اس آسمان تلے واقعی آزاد ہیں۔ میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا اور کہا

تم نے وہ تازہ ریگولیشن نہیں پڑھا جس پہ پرندوں کا ذکر اور آسمان کی طرف دیکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں نے اسے اخبار تھمایا تو وہ اسے مروڑتا ہوا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لوگوں کی گردنوں پر اتنے بھاری پتھر رکھے گئے ہیں کہ اب وہ آسمان کی طرف نہیں دیکھ سکتے اور پرندے" (دھکی اور پرندے کا گوشت) پرندوں کی مثال آزادی کا یہ تمنائی بالآخر یہ کہتے ہوئے جان سے گذر جاتا ہے کہ " نصف ایمان کے ساتھ جینا گناہ ہے " اب ناولٹ " بستی " میں دو دوستوں کا مکالمہ سنیئے:

" کیا سوچ رہے ہو ؟ " میرے ساتھی نے مجھے کافی دیر سے خاموش دیکھکر پوچھا

" سوچنا ہمارا کام نہیں ۔ جب بولنا خطرناک ہو تو چپ رہنا چاہیئے " میں نے سر جھکا کر کہا۔

" بولنا چاہیئے تاکہ آدمی کی پہچان ہوتی رہے " اس نے باہر گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔"

احمد داؤد پورے ایمان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کے نزدیک " آدمی ہونے کا جواز سوچنے میں " اور " آدمی کی پہچان بولنے میں ہے " سو وہ سوچتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے اور یہ وہ وصف ہے جو ہمارے ہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اسی وصفِ خاص کی بدولت مجھے احمد داؤد اور اس کا فن ہر دو عزیز تر ہیں۔ باقی رہے اس کی افسانہ نگاری کے فنی محاسن تو ان کا بیان میں محبتی گوپی چند نارنگ پر چھوڑتا ہوں۔

احمد داؤد جدید اُردو افسانے کا سربرآوردہ نام ہے اس کا تخلیقی سفر خاصہ تیز، دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے احمد داؤد نے کامل چابکدستی کے ساتھ نظریہ اور فن کے مابین وسیع سے وسیع تر ہوتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کامیاب سعی کی ہے اس کا تازہ ترین مجموعہ اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس نے جدید اردو کو ہم عصر معنویت سے ہم رشتہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ دوسروں کیلئے قابلِ تقلید فنکار بن کر اُبھر رہا ہے۔

محمد علی صدیقی

احمد داؤد کی کہانیوں کا دروبست توانا تجسس، معنی خیز تحیر کے ساتھ ساتھ، فراواں قوت، ادراک کا آئینہ دار ہے کہانی اس کے لیے منقسم اور سطحی لکیروں کے مابین تشکیل پانے والا سیناریو ہرگز نہیں، کہ ناظر و منظور کی ثنوی حد بندی کا ایجاب اس کے ہاں لایعنی مفروضہ ہے۔ یہی سبب کہ اس کے دائرہ تصرف سے کنکریٹ کی بہت سی تدبیریں ٹوٹ کر پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ذات کی تیسری کمونٹ کی بازیافت میں اس کا طریقِ کار یہ ہے کہ وہ کسی ایک مقام پر ارتکاز کی بجائے ناظر، منظور اور تناظر۔ تثلیث کی تینوں اطراف واردات کے بطن میں اترتا ہے۔ تثلیث کے ان تینوں زاویوں کے محیط میں کائنات لاتعداد کبیرہ و صغیرہ آئینوں کا سحر کار منظر نامہ ہے۔ جہت در جہت ادراک و احساس، بدلتی بگڑتی مکروہ صورتیں، ٹوٹ پھوٹ، چہرے، محدب اور مقعر شیشے، طویل ہوتی پرچھائیاں، چٹختے خواب، عکس و معکوس مناظر، میں کے عقب میں، میں۔ داخلی دنیا اور خارج کی حسی زندگی کا تصادم اور کرتا، ہوگتا جھوٹ ——— یہ سب مرحلے ہیں جن سے احمد داؤد اپنی راہیں تراشتا ہے یوں اس کے افسانوں میں کہانی کا انقطاع ناممکن تصور ہے کہ کہانی تو اس کے فنی رابطوں اور قرینوں میں معتبر وصف ہے۔ تاہم زبان کا مانوس سیاق و سباق، صرف و نحو کی غلام گردشیں اور سابقوں اور لاحقوں کے گھیراؤ میں لسانی ہیئتیں پسماندہ روایتیں ہیں۔ احمد داؤد تشبیہی اور تلازماتی منطق کی عمومیت زدہ راہ سے ہٹ کر تجربے کو قدرتی لسانی آہنگ سے ہمکنار کرتا ہے۔ تیز اور نوکیلا قدرتی لسانی آہنگ ——— اظہر ہے پتھر ہوتی تنقید کے لیے احمد داؤد کی اس جراتِ رندانہ کو اذنِ باریابی بخشنا ناقابلِ فہم ہے۔

اقبال آفاقی

احمد داؤد کی کہانیاں اپنے موضوعات کے تنوع اور اسلوب و تکنیک کے حوالے سے مخصوص تاثر رکھتی ہے ——— میں اس کے افسانے، اپنے گنے چنے پسندیدہ شاعروں کے کلام کی طرح پڑھتا ہوں۔

حسن عباس رضا

ایک ایسے عہد میں جب افسانہ گنبدِ بے ہنگم اور لایعنی آوازوں سے بھرا ہوا ہے۔ احمد داؤد کی توانا اور تنومند آواز اس شور سے بڑبڑاتے ہوئے قاری کو دلاسا دیتی ہے۔ تشکیک، بے یقینی اور اجتماع کے بحران میں احمد داؤد ایک طرف تو ریاتی دیمک زدہ حویلیوں کی درزیں اور دراڑیں کھوجتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے عہد کی ہولناک صداقتوں کے اظہار میں جدید ترین فکری اور تاریخی تلازمے کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے میرے عصر میں ایسے افسانہ نگار انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں، جنہوں نے جتنے افسانے لکھے ہوں سب کے سب فن اور تخلیق کے اعلیٰ پیمانوں پر پورے اترتے ہوں۔ احمد داؤد بلا شبہ اگر چاہے تو اپنی اس صلاحیت پر فخر بھی کر سکتا ہے۔

نثار ناسک